سوداگر کی بیٹی

سوداگر کی بیٹی

ایرانی کہانیاں

مقبول جہانگیر

1976

فہرست

زین العرب کا خزانہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ایران کے ایک شہر اصفہان میں زین العرب نام کا ایک غریب شخص رہتا تھا۔ بے چارہ دن رات کولہو کے بیل کی طرح محنت مزدوری کرتا، تب کہیں جا کر اسے اور اس کے بال بچوں کو دو وقت کی روکھی سوکھی نصیب ہوتی۔

زین العرب منہ اندھیرے اٹھتا اور جنگل میں جا کر کبھی لکڑیاں کاٹتا، کبھی لوگوں کے گھروں میں پانی بھرتا اور کبھی مزدوروں میں شامل ہو کر اینٹ گارا ڈھوتا۔ صبح سے شام تک ایسے ہی سخت کاموں میں جُتے رہنے کے باعث وہ رات کو تھکا ہارا واپس گھر آتا اور روٹی کھا کر سو جاتا۔ ہفتے کے ساتوں دن بارہ بارہ گھنٹے کام کرتا۔ اسے کبھی سیر تفریح کا موقع نہ ملتا تھا۔

بہت دن یوں ہی گزر گئے۔ دن رات محنت کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کے پاس کچھ روپیہ جمع ہو گیا۔ سچ ہے، خدا کبھی کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ زین العرب نہایت نیک اور دیانت دار آدمی تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ دوسروں کی طرح بے ایمان کر کے دولت جمع کرے اور محنت کرنے کے بجائے عیش و آرام کی زندگی گزارے۔ اب ایسے دن بھی آنے لگے کہ اسے اور اس کے بال بچوں کو پیٹ بھر کر روٹی ملنے لگی۔ وہ سب خدا کا شکر ادا کرتے۔

چند برس کے اندر اندر زین العرب کے پاس بہت ساری سونے کی اشرفیاں جمع ہو گئیں۔ جب وہ ان اشرفیوں کو دیکھتا تو اس کا چوڑا چکلا سینہ خوشی سے پھولنے لگتا۔ یہ اس کی محنت کی کمائی تھی اور ہر شخص کو اپنی محنت کی کمائی پر فخر ہوتا ہے۔

لیکن اس خوشی کے ساتھ ساتھ زین العرب کو ایک غم بھی بار بار ستانے لگتا۔ وہ غم یہ تھا کہ کہیں اُس کی محنت کا یہ پھل کوئی چپکے سے اُڑا نہ لے۔ چوروں کا کیا اعتبار۔ اگر خدانخواستہ کسی ایسے ویسے کے کان میں بھنک پڑ گئی کہ زین العرب

کے پاس اشرافیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی ہے تو۔۔۔؟ اس سے آگے غریب مزدور نہ سوچ سکا۔ اصل میں اس خیال ہی سے اُس کے پسینے چھوٹنے لگتے تھے کہ کوئی چالاک چور رات کے اندھیرے میں آئے اور اشرفیوں کی یہ تھیلی اُٹھا کر چل دے۔

آخر اس نے فیصلہ کیا کہ ان اشرافیوں کو چوروں کے ہاتھوں محفوظ کرنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت ایسی جگہ چھپائے جہاں چور تو کیا، چور کا باپ بھی نہ پہنچ سکے۔

ایک رات جب کہ اصفہان شہر کے سب لوگ گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے اور گلی کوچوں میں آوارہ گرد کتوں کے سوا کوئی نہ تھا، زین العرب چپکے سے اُٹھا، آہستہ سے اپنے مکان کی دیوار پھاندی اور دبے پاؤں چلتا ہوا قریب کے جنگل میں پہنچا۔ اس نے جلدی جلدی ایک درخت کے نیچے گڑھا کھودا اور اشرفیوں کی تھیلی اس میں دبا دی۔ گھر واپس جانے سے پہلے اس نے درخت کو

اچھی طرح ذہن میں بٹھالیا تا کہ دوبارہ جب چاہے، یہاں آن کر اپنی دولت نکال سکے۔

اس کارروائی کے بعد وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا واپس اپنے مکان میں آ گیا۔ خُدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ کسی نے اُسے آتے دیکھا نہ جاتے۔ سوائے اُن ایک دو کتّوں کے جو اس کے مکان کے سامنے ہی ہڈیوں کی تلاش میں زمین سونگھتے پھر رہے تھے اور ظاہر ہے کتّے کسی سے کسی کا راز نہیں کہا کرتے۔

گھر آ کر زین العرب نے محسوس کیا کہ دولت چوری ہو جانے کا جو خوف اس کے دل و دماغ پر بیٹھا ہوا تھا وہ دور ہو چکا ہے اور اب وہ اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا سمجھ رہا تھا۔ پھٹے پرانے بستر پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ چند برسوں میں کچھ اور پیسے جمع ہو جائیں گئے تو محنت مزدوری کا کام چھوڑ کر کوئی چھوٹی موٹی دُکان کھول لوں گا۔ آخر کوئی آدمی کب تک اتنی محنت و مشقت کا کام کر سکتا ہے۔ سدا کوئی جوان نہیں رہتا اور نہ ہمیشہ اس کے بازوؤں میں

طاقت رہتی ہے۔ ایک نہ ایک دن بڑھاپا آن دبوچے گا۔

پندرہ بیس دن گزر گئے۔ ایک رات زین العرب کو خیال آیا کہ ایک نظر جا کر اپنی دبی ہوئی دولت کو دیکھ تو آئے۔ اشرفیاں گننے اور یہ اطمینان کر لینے کی خواہش اس کے دل میں انگڑائیاں لینے لگی کہ اس کی دولت درخت کے تلے زمین کے اندر ہر طرح محفوظ ہے۔ اس نے چور نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بیوی اور بچّے گہری نیند سو رہے تھے۔ باہر گلی کوچوں میں سنّاٹا تھا۔ وہ دبے پاؤں مکان سے نکلا اور جنگل کی طرف روانہ ہوا۔

اس کی خوش نصیبی تھی کہ آدھی رات کے وقت کسی شخص نے اسے جنگل میں جاتے نہ دیکھا۔ اسے وہ درخت اچھی طرح یاد تھا جس کے نیچے اس نے گڑھا کھود کر اشرفیوں کی تھیلی دبائی تھی۔ وہ سیدھا اس درخت کے پاس پہنچا۔ درخت کے اِرد گرد کی مٹّی نرم اور پولی تھی۔ زین العرب خوشی خوشی دونوں ہاتھوں سے مٹی کھود کھود کر پرے پھینکنے لگا۔ صرف ایک ہاتھ کی گہرائی میں اُس کا خزانہ دفن تھا۔

لیکن اُس نے تو کئی ہاتھ گہری مٹّی کھور ڈالی تھی اور خزانے کا کہیں پتا نہ تھا۔

یہ دیکھ کر زین العرب کے ہوش اُڑ گئے کہ اُس گڑھے میں سے تھیلی غائب تھی۔ سیدھا کھڑا ہو کر اس نے درخت کو نیچے سے اُوپر تک خوب غور سے دیکھا۔ بے شک یہی وہ درخت تھا۔ اُس کی آنکھیں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ اُس نے جلدی جلدی دوسری جگہ سے مٹی ہٹانی شروع کی، مگر بے سود۔ وہاں بھی اسی کی تھیلی نہ تھی۔ اس کو پورا یقین تھا کہ اس درخت کے نیچے اس نے تھیلی دفن کی تھی لیکن کوئی نامعلوم چور یہ تھیلی نکال کر لے گیا تھا۔

یہ سوچتے ہی اس کا سر چکرانے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر چور کو اس تھیلی کی موجودگی کا علم کیسے ہوا؟ کیا کسی نے اسے گھر سے نکلے اور جنگل میں گڑھا کھود کر تھیلی دباتے ہوئے دیکھ لیا تھا؟

بے چارے مزدور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اسے یوں

لگا جیسے سارا جنگل گھوم رہا ہے اور درختوں کے پتے تالیاں بجا بجا کر اس کی مصیبت پر خوش ہو رہے ہیں۔ اسے بالکل یاد نہیں رہا کہ وہ اپنے مکان تک کِس طرح واپس پہنچا۔ خیر گزری کہ اس کی بیوی ابھی تک سو رہی تھی ورنہ وہ اپنے شوہر کی یہ ابتر حالت دیکھ کر ضرور پوچھ گچھ کرتی کہ وہ اتنی رات گئے کہاں گیا تھا؟

اس رات اُسے بالکل نیند نہ آئی۔ رہ رہ کر دل آپ ہی آپ بیٹھنے لگتا اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ اسے کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ وہ دولت جو اس نے برسوں کی محنت کے بعد جمع کی تھی، یوں آناً فاناً ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ یہ بات بھی اس کے ذہن میں نہ آتی تھی کہ وہ چور کو کیسے تلاش کرے اور اس معاملے میں کس سے مشورہ لے؟ کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ہمدردی اور افسوس کے دو بول ہی اس کے حق میں کہہ دیتا۔ پھر سوال یہ تھا کہ اگر وہ کسی سے فریاد کرے بھی تو اس سے پوچھا جائے گا کہ یہ اشرفیاں آئیں کہاں سے آئیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس پر شک کیا جائے کہ اس نے یہ اشرفیاں کہیں سی چرائی ہیں۔

اس پریشانی میں وہ دل لگا کر کام بھی نہ کر سکا۔ اسی پریشانی میں میں غرق تھا کہ اس کی ملاقات ایک سوداگر سے ہوئی۔ یہ سوداگر شہر کا ایک امیر شخص تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ ایک آدمی پریشانی کے عالم میں بیٹھا ہوا ہے تو سوداگر نے اس کی مدد کرنے کا ارادہ کیا۔

کچھ دیر تک تو زین العرب نے ٹال مٹول سے کام لیا کیوں کہ وہ اس سوداگر کو جانتا نہ تھا اور ایسا قیمتی راز اس پر ظاہر کرنا لیکن جب اس سوداگر سے بات کرنے لگا تو اسے قابلِ بھروسہ شخص لگا۔ اس نے تمام قصہ سوداگر کو سنایا۔

سوداگر نے کہا۔ ”یہ خدا کی طرف سے تمہارے لیے ایک کڑی آزمائش ہے۔ صبر سے کام لو۔ وہ اشرفیاں تم نے محنت اور حق حلال کی کمائی سے حاصل کی ہیں، اور کوئی چور اُنہیں چُرا نہیں سکتا۔ مجھے اس معاملے پر غور کر کے کوئی ایسی تدبیر سوچنی پڑے گی کہ تمہاری کھوئی ہوئی اشرفیاں تمہیں واپس مل جائیں۔ اتنے بڑے شہر میں اس شخص کو ڈھونڈنا بڑا مشکل کام ہے جس کے ہاتھ تمہاری دولت

لگی ہے، لیکن خدا کوئی نہ کوئی سبب ضرور پیدا کر دے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تم رات کے اندھیرے میں گڑھا کھود کر اشرفیوں کی تھیلی دبا رہے تھے، کوئی شخص وہاں پر موجود تھا جب تم گھر واپس چلے گئے تو وہ شخص درخت کے نیچے گیا اور گڑھے میں سے تھیلی نکال کر رفوچکر ہو گیا۔ اب تم مجھے دس دن کی مہلت دو۔ اس عرصے میں شاید کوئی ایسی تدبیر میرے دماغ میں آ جائے جس پر عمل کر کے میں تمہاری کھوئی ہوئی دولت چور سے واپس دلا سکوں۔"

زین العرب نے خوش ہو کر کہا۔ "جناب، آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ زندگی بھر آپ کے بال بچوں کو دعائیں دوں گا۔"

دس دن کی بساط ہی کیا تھی۔ پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ سوداگر نے اس دوران میں سیکڑوں تدبیریں سوچیں مگر اِن میں ایک بھی ایسی نہ تھی جو کارآمد ثابت ہوتی اور جس پر عمل کرنے سے بے چارے مزدور کی قسمت جاگ اُٹھتی۔

ٹھیک گیارہویں روز زین العرب امیدوں بھرا دل لے کر سوداگر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے زین العرب کو بڑی محبت سے اپنے قریب بٹھایا اور کہنے لگا:

"میرے بھائی یقین کرو، ان دس دنوں میں دن رات تمہارے معاملے ہی پر غور کرتا رہا ہوں، کوئی تدبیر ایسی نہیں سوجھی جو کارآمد ہوتی۔ خدا کے کام عجیب و غریب ہیں، وہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ ممکن ہے کچھ عرصے بعد خود بخود ایسی صورت پیش آئے کہ چور کا اتا پتا لگ سکے۔ تمہیں خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے۔"

ابھی اس کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ شہر کی گلیوں میں پھرنے والا ایک پاگل فقیر وہاں آن پہنچا۔ اس کے کپڑے بوسیدہ اور پرانے تھے۔ ڈاڑھی، سر اور مونچھوں کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔ اس نے زین العرب اور امیر آدمی کو اپنی سُرخ سُرخ آنکھوں سے گھورا۔ پھر ایک آنکھ دبا کر بولا:

”ہی چپکے چپکے کیا باتیں ہو رہی ہیں یارو؟ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟“

سوداگر نے زین العرب سے کہا: ”میرا خیال ہے اس فقیر کو سارا قصہ بتا دینا چاہیے۔ کبھی کبھی یہ دیوانے بات لوگ ایسی بات بتا دیتے ہیں جو داناؤں کے ذہن میں بھی نہیں آتی۔“

زین العرب نے جواب دیا۔ ”جناب میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں تو ضرور بتا دیجیے۔“

دیوانے فقیر نے اچانک ان دونوں کے گرد گھوم گھوم کر ناچنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ تالیاں بھی بجاتا جا رہا تھا۔ فقیر کو ناچتے دیکھ کر گلی میں سے گزرنے والا نو برس کا ایک لڑکا بھی یہ تماشا دیکھنے کو رُک گیا۔

تھوڑی دیر ناچنے کے بعد فقیر آپ ہی آپ تھم گیا اور ڈانٹ کر بولا۔ ”کیا تم لوگوں نے سنا نہیں؟ جلدی بتاؤ کیا معاملہ ہے اور تم دونوں آپس میں کیا باتیں کر

رہے تھے؟ اگر نہیں بتاؤ گے تو اینٹ مار کر تم دونوں کے سر پھاڑ دوں گا۔"

اور یہ کہتے ہی وہ اینٹ اٹھانے لپکا۔ تب سوداگر نے فقیر کو روک کر شروع سے آخر تک زین العرب پر بیتی تھی، وہ کہہ سنائی۔ دیوانہ غور سے سنتا رہا۔ جب سارا قصہ تمام ہوا تو اس نے اُٹھ کر پھر ناچنا شروع کر دیا۔ سوداگر اور زین العرب چُپ چاپ دیوانے کو ناچتے ہوئے دیکھتے رہے۔ آخر اس نے کہا۔

"آہا۔۔۔ میں نے چور پکڑ لیا۔۔۔ چور پکڑ لیا۔۔۔ وہی ہے۔۔۔ وہی ہے۔۔۔ مگر وہ چور نہیں ہے۔۔۔ وہ تو دوا کی تلاش میں آیا تھا۔۔۔ اسے اس درخت کی جڑوں کی ضرورت تھی۔۔۔ جب اس نے جڑیں کاٹنے کے لیے زمین کھودی تو اشرفیوں کی تھیلی بھی نکل آئی۔۔۔ جڑوں کے ساتھ وہ تھیلی بھی لے گیا۔۔۔ تھلی بھی لے گیا۔۔۔ آہاہاہا۔۔۔ آہاہا۔۔۔!"

اور یوں وہ فقیر ناچتا، مٹکتا مکان سے باہر نکل گیا۔ لڑکا وہیں کھڑا رہا۔ فقیر کے

جانے کے بعد سوداگر اور زین العرب آپس میں اس بات پر بحث کرنے لگے کہ فقیر نے جو کچھ کہا ہے، آخر اس کا اصل مطلب کیا تھا۔ اتنے میں وہ لڑکا بول پڑا:

"اس درخت کا نام کیا ہے جس کے نیچے اس مزدور نے اشرفیوں کی تھیلی دبائی تھی؟"

"وہ درخت زیتون کا تھا۔" زین العرب نے کہا۔

"بس تو پھر معاملہ صاف ہے۔" لڑکا کہنے لگا۔ "تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ شہر میں جتنے بھی طبیب ہیں، باری باری سب کے پاس جا کر پوچھو کہ کیا پچھلے دس پندرہ میں کوئی ایسا شخص ان کے پاس آیا تھا جس کو انہوں نے زیتون کی جڑ لانے کو کہا تھا؟"

سوداگر نے زین العرب کو اپنے ساتھ لیا اور باری باری تمام حکیموں سے پوچھنے لگا کہ کیا انہوں نے کسی کو زیتون کی جڑ استعمال کرنے کہ ہدایت کی تھی۔ ایک حکیم

نے اِقرار کیا اور اس نے بتایا ”اس شہر کا ایک نامی گرامی تاجر، جس کا نام خواجہ سمندر تھا، اس کے پاس علاج کی غرض سے آیا تھا۔ اُسے دمے کا مرض تھا۔ میں نے اسے زیتون کی جڑ استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا کہ زیتون کی جڑوں کو پانی میں جوش دو اور استعمال کرو۔ اگر خدا نے چاہا تو یہ تکلیف جاتی رہے گی۔“

اس تاجر کو شہر کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ وہ اپنی شاندار حویلی میں رہتا تھا اور نہایت نیک آدمی سمجھا جاتا تھا۔ سوداگر زین العرب کو لے کر خواجہ سمندر کی حویلی پہنچا۔ خواجہ نے فوراً انہیں اندر بلایا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ سوداگر نے خواجہ کو ساری بات بتائی۔ خوجہ سمندر ہنس کر بولا:

”حکیم کی تجویز کے بعد میں جنگل میں زیتون کی جڑ کی تلاش میں گیا۔ جنگل میں جاتے ہی مجھے جو پہلا زیتون کا درخت ملا میں نے اس کی جڑوں کو کھودنا شروع کیا۔ کیا دیکھا کہ جڑوں میں ایک تھیلی دبی ہے۔ میں جڑوں کے ساتھ ساتھ اس تھیلی کو بھی ساتھ لے آیا تاکہ اس کے اصل مالک تک پہنچا سکوں۔ چونکہ یہ آپ

کی محنت کی کمائی تھی اس لیے یہ رائیگاں نہیں گئی۔"

اس کے بعد اس نے وہ تھیلی زین العرب کے حوالے کی۔ زین العرب نے سوداگر اور خواجہ سمندر کا شکریہ ادا کیا اور تھلی لے کر خوشی خوشی گھر کو روانہ ہوا۔

سویا ہوا نصیبہ

کسی گاؤں میں ایک زمیندار رہا کرتا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ جس اس زمیندار کا انتقال ہوا تو اس نے دونوں بیٹوں کو بُلایا اور اپنی تمام زمین دونوں بیٹوں میں برابر تقسیم کر دی۔ بڑے بیٹے کے حصے میں جو زمین آئی وہ بالکل بنجر تھی جب کہ چھوٹے بیٹے کے حصے میں زرخیز زمین کا ٹکڑا آیا۔ بڑے بھائی نے سوچا کہ اپنے چھوٹے بھائی کے پاس جائے اور اس سے کہے کہ میری زمین تم لے اور اپنی زمین مجھے دے دو۔

بڑے بھائی کی یہ درخواست ہی عجیب تھی۔ بھلا دنیا میں ایسا بے وقوف کون تھا جو بنجر زمین کے بدلے میں اچھی خاصی سونا اُگلنے والی زمین دے دیتا۔ لیکن چھوٹا بھائی بہت نیک اور شریف تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کو باپ کی جگہ جانتا تھا۔

اُس نے بڑے سکون سے بھائی کی بات سُنی اور اطمینان سے کہا۔

”بڑے بھیّا، میری زمیں کس کی ہے؟ وہ بھی تو آپ ہی کی ہے۔ اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ جس زمین میں میں فصل بوتا ہوں، وہ آپ کے لیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ بڑے شوق سے لے لیں۔“

دونوں بھائیوں نے زمینوں کا تبادلہ کر لیا۔ بڑا بھائی خُوش تھا کہ بنجر زمین سے چھُٹکارا ملا۔ اب وہ مزے سے کم کام کرے گا اور بھرپور فصل زمیں سے اُگائے گا۔ مگر اس کا یہ شوق کبھی پورا نہ ہوا۔ بنجر زمین پر چھوٹے بھائی کی محنت پھل لانے لگی اور چھوٹے بھائی کی وہ زمیں جو بڑے بھائی نے حاصل کی تھی۔ یہ صورت بڑے بھائی کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے خیال کیا ضرور چھوٹے بھائی کو کوئی ایسا منتر معلوم ہے جس کے ذریعے وہ بنجر زمین کو بھی کاشت کے قابل بنا سکتا ہے۔ یکایک ایک انوکھی تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے سوچا، آدھی رات کے بعد چھوٹے بھائی کے کھیت میں جاؤں اور وہاں سے تھوڑا

سا اناج لا کر اپنی فصل کے اوپر بکھیر دوں۔ شاید اسی کی برکت سے میری زمین بھی اناج اُگانے لگے۔

وہ بڑی بے چینی سے سورج کے ڈوبنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب اندھیرا گہرا ہو گیا تو اس نے اپنے گدھے کو ہانکا، ایک خالی بوری اس کی پیٹھ پر رکھی اور چھوٹے بھائی کے کھیتوں کی طرف چل دیا۔ وہاں جاتے ہی اس نے گدھے کی پیٹھ سے خالی بوری اُتاری اور درانتی ہاتھ میں لے کر فصل کاٹنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔

لیکن اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی۔ ایک شخص لپک کر اس کے سامنے آگیا اور ڈپٹ کر بولا:

"کون ہو تم، اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

بڑے بھائی نے حیرت سے اس شخص کو دیکھا اور اطمینان سے پوچھا۔ "یہی سوال میں تم سے کرتا ہوں کہ تم اس وقت میرے چھوٹے بھائی کے کھیت میں چھُپے

ہوئے کیا کر رہے ہو؟"

یہ سن کر اس اجنبی شخص نے زور دار قہقہہ لگایا اور کہا۔ "جاننا چاہتے ہو کہ میں کون ہوں؟لو سُنو۔ میں تمھارے چھوٹے بھائی کا نصیبہ (قسمت) ہوں اور یہ میرا فرض ہے کہ اس کے کھیتوں اور کھلیان کی دن رات حفاظت کروں تا کہ کوئی چور اسے چُرا کر نہ لے جائے۔"

بڑے بھائی کا منہ یہ الفاظ سن کر حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ دیر تک کوئی بات اس کی زبان سے نکل نہ سکی۔ آخر اس نے بڑی مشکل سے اپنے ہوش و حواس پر قابو پا کر کہا:

"کیا واقعی تم میرے چھوٹے بھائی کا نصیبہ ہو؟"

اجنبی نے جواب دیا "بے شک۔"

”تب مجھے بتاؤ کہ میرا نصیبہ کہاں ہے؟“ بڑے بھائی نے پوچھا۔

”تمھارا نصیبہ؟“ پراسرار اجنبی نے کہا۔ ”ہاں مجھے معلوم ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہے۔ غور سے سنو۔ یہاں سے پانچ سو کوس

دُور ایک بڑا سا پہاڑ ہے۔ تمہارا نصیبہ اس پہاڑ کی چوٹی پر سویا ہوا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری زمین ویران نہ رہے اور خُوب اناج اُگائے تو ابھی جاؤ اور اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر اپنے نصیبے کو جگاؤ۔“

بڑے بھائی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس اپنی زمین پر لوٹ آیا۔ اگلے روز مُنہ اندھیرے اُٹھ کر اس نے سفر کے لیے سامان تیار کیا۔ پھر اپنے چھوٹے بھائی کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ میں ایک لمبے سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔ میری واپسی تک تم میری زمین کی دیکھ بھال کرنا۔ چھوٹے بھائی نے بہت پوچھا کہ بھیّا کہاں جا رہے ہو؟ کب تک لوٹو گے؟ لیکن بڑے بھائی نے اُسے کچھ نہ بتایا اور سفر پر چل پڑا۔

دو دن اور دو راتیں چلنے کے بعد وہ ایک جنگل میں پہنچا۔ جنگل میں ہر قسم کے پرندے، چرندے اور درندے بھرے پڑے تھے۔ قدم قدم پر کانٹوں سے بھری جھاڑیاں راستہ روکے کھڑی تھیں لیکن وہ ان میں سے گزرتا چل گیا۔

یکایک قریب ہی سے شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی۔ یہ آواز ایسی خوف ناک تھی کہ بڑے بھائی کا کلیجا اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ تمام بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ ابھی وہ کسی درخت پر پناہ لینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شیر کی ہولناک گرج پھر سنائی دی۔ بڑے بھائی کے پاؤں دہشت سے من من بھر کے ہو گئے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پاؤں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے ہیں۔

تیسری بار شیر کی آواز اور قریب سے آئی۔ بڑے بھائی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بہت بڑا شیر جھاڑیوں سے نکل کر آہستہ آہستہ اسی کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ شیر کا جبڑا کھلا ہوا تھا اور اس میں سے لمبے نوکیلے بڑے بڑے

دانت صاف نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سُرخ تھیں۔ بڑے بھائی کا خُون اس کی رگوں میں خوف سے جمنے لگا۔ وہ سمجھا کہ اب موت آئی۔

اچانک وہ شیر کے سامنے عاجزی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا:

"اے جنگل کے بادشاہ، دیکھ، مجھے نہ کھائیو۔ میں ایک ضروری کام سے پانچ سو کوس کے سفر پر جا رہا ہوں۔"

"ہاہاہا۔۔۔۔۔!" شیر نے گرج کر کہا۔ "میں کئی دن سے بھُوکا ہوں اور ویسے بھی آدمی کا لذیذ گوشت کھائے مجھے مدّت ہو گئی ہے۔ تجھے ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ مگر یہ تو بتا کہ اتنے لمبے سفر پر آخر کس لیے جا رہا ہے؟"

"میں اپنا سویا ہوا نصیبہ جگانے جا رہا ہوں، اے بہادر شیر۔" بڑے بھائی نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا یہ بات ہے۔" شیر نے کہا "تب تو تجھے چھوڑا ہی پڑے گا۔ لیکن میری ایک شرط ہو گی۔"

”کیا شرط ہے؟“ بڑے بھائی نے پوچھا۔

”جب تم اپنے نصیبے سے ملو تو میرے ایک سوال کا جواب پوچھو گے۔“ شیر نے کہا۔

”کیسا سوال؟“ بڑے بھائی نے پوچھا۔

”مجھے ایک بیماری ہے کہ جب بھی میں کچھ کھاتا ہوں تو میری بھوک نہیں مٹتی اور جلد ہی دوبارہ بھوک ستانے لگتی ہے۔ جب تم اپنے نصیبے سے ملو تو پوچھنا کہ میں اس بیماری سے کیسے نجات پا سکتا ہوں۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارے سوال کو جواب ضرور پوچھوں گا۔“ بڑے بھائی نے کہا اور جنگل سے نکل کر تیزی سے اپنی منزل کی طرف چل دیا۔

چلتے چلتے راستے میں رات ہو گئی اور اسے بھوک نے ستایا۔ دیکھا کہ ایک جھونپڑی

میں آگ جل رہی ہے۔ بڑے بھائی نے دستک دی تو ایک بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا۔ بڑے بھائی نے اپنی تمام کہانی اسے سنائی اور رات بسر کرنے کی اجازت مانگی۔

"میں ایک شرط پر تمہیں اپنا مہمان بنا سکتا ہوں۔" اس شخص نے کہا۔

"کیا شرط ہے؟" بڑے بھائی نے پوچھا۔

"جب تم اپنے نصیبے سے ملو تو میرے ایک سوال کا جواب پوچھو گے۔" اس شخص نے کہا۔

"کیسا سوال؟" بڑے بھائی نے پوچھا۔

"میں ایک کسان ہوں۔ بہت محنت سے کھیتی باڑی کرتا ہوں میری تمام زمین میں اناج پیدا ہوتا ہے لیکن ایک ٹکڑا ایسا ہے جہاں محنت کے باوجود کوئی چیز نہیں

اُگتی۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس بنجر زمین میں کوئی چیز کیوں پیدا نہیں ہوتی؟"

بڑے بھائی نے حامی بھرلی۔ کسان نے اسے کھانا کھلایا اور رات بستر کرنے کی جگہ دی۔

اگلے دن رخصت ہو کر اپنے راستے پر چل دیا۔ شام کو وہ ایک شہر کے دروازے پر پہنچا۔ محافظوں نے مشکوک جان کر اسے گرفتار کر لیا اور اپنے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اس نے پوچھا کہ تم کس ارادے سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟"

بڑے بھائی نے اسے سارا ماجرا سنایا اور کہا کہ "میں اپنا نصیبے کو جگانے جا رہا ہوں۔"

"بہت خوب۔" بادشاہ نے خوش ہو کر کہا "جب تم اپنے نصیبے سے ملو تو ایک سوال کا جواب ہماری طرف سے بھی معلوم کرنا۔ ہم اپنے ملک اور رعایا کی خوشحالی کے لیے اتنا کام کرتے ہیں جس کی حد نہیں۔ اس کے باوجود ملک کی حالت روز بروز

بگڑتی جارہی ہے اور رعایا خُوش نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ کیا ہے ؟"

بڑے بھائی نے عرض کیا۔ "حضور اطمینان رکھیں۔ میں اپنے نصیبے سے مل کر آپ کے اس سوال کا جواب ضرور معلوم کروں گا۔"

بادشاہ نے اسے نئے کپڑے بنوا کر دیے، ایک دو دن شاہی محل میں اپنا مہمان بنایا، پھر رخصت کر دیا۔

بڑا بھائی شہر سے نکل کر تیزی سے اپنی منزل کی جانب روانہ ہوا۔ آخر وہ دن بھی آیا جب اس عظیم الشان پہاڑ کی چوٹی میلوں دور سے دکھائی دینے لگی۔ بڑے بھائی نے اپنی رفتار اور تیز کر دی، اور ایک چمکیلی اور خوش گوار صبح کو وہ پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا۔

رات بھر آرام کرنے کے بعد وہ مُنہ اندھیرے پہاڑ پر چڑھنے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ بعض جگہ چٹانیں تیر کی طرح سیدھی اور خطرناک تھیں اور ان پر

قدم رکھنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ لیکن اپنے نصیبے سے ملاقات کے شوق میں اس نے جان کی پروا بھی نہ کی اور رُکے بغیر چڑھتا گیا۔ شام کے وقت اس نے اپنے آپ کو برفانی چوٹی کے بالکل قریب پایا۔ دن بھر کی سخت چڑھائی کے باعث پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے اور پنڈلیاں لکڑی کی طرح اکڑ کر سخت ہو گئی تھیں۔

چوٹی پر اس نے ایک بہت خوب صورت اور لمبے تڑنگے آدمی کو سوئے ہوئے پایا۔ اس نے خوش ہو کر اپنے آپ سے کہا:

"معلوم ہوتا ہے یہی ہے میرا نصیبہ۔"

یہ کہہ کر وہ چپکے چُپکے اس کے قریب گیا اور کندھا ہلا کر بولا۔ "اُٹھو۔۔۔اُٹھو۔۔۔ کیا تم ہمیشہ یوں ہی سوتے رہو گے۔"

سوئے ہوئے آدمی نے کروٹ لی۔ پھر اپنی آنکھیں ملیں، ایک زور دار جمائی لی

اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے بھائی کی طرف غور سے دیکھا اور کہا:

”آہا۔۔۔ تم آ گئے۔ اطمینان رکھو، اب میں دوبارہ کبھی نہ سوؤں گا۔ بولو تمہیں مجھ سے کچھ کہنا سُننا ہے؟“

”ہاں ہاں۔ میں تم سے چند سوالوں کا جواب لینے آیا ہوں۔

بڑے بھائی نے پہلے بادشاہ کا سوال اسے بتایا۔ نصیبہ بولا۔ ”وہ بادشاہ دراصل مرد نہیں بلکہ ایک عورت ہے۔ اس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔ اسے چاہیے کہ اس بات کو اپنی رعایا پر ظاہر کر دے اور شادی کر لے تو اس کی رعایا اس کی محنت کی قدر کرنے لگ جائے گی۔“

”بہت اچھا۔“ بڑے بھائی نے کہا۔ ”میرا دوسرا سوال کسان کے بارے میں ہے۔ اس کے کھیت میں فصل کیوں پیدا نہیں ہوتی؟“

"دراصل اس کھیت میں ایک بہت بڑا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ جب تک وہ خزانہ اس کھیت میں دبا رہے گا، اس میں فصل پیدا نہ ہو گی۔" نصیبے نے کہا۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہوئی۔" بڑا بھائی بولا۔ "اور میرا آخری سوال اس شیر کے بارے میں ہے۔ اس کی بیماری کا علاج کیا ہے؟"

"اس کی بیماری کا علاج یہ ہے کہ جب کبھی وہ ایسے آدمی کو دیکھے کو نہایت احمق اور بے وقوف ہوتا اسے فوراً چیر پھاڑ کر کھا جائے۔ ایسا کرنے سے اس کی بیماری جاتی رہے گی۔"

"بہت شکریہ۔ اب میں واپس چلتا ہوں۔" بڑے بھائی نے کہا۔

اس کے بعد وہ تیزی سے سفر کرتا ہوا بادشاہ کے پاس آ پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی بادشاہ نے پوچھا۔

”کیوں میرے سوال کا جواب لائے ہو؟“

”جی حضور۔ لیکن میں یہ بات آپ سے اکیلے میں کہنا چاہتا ہوں۔“ بڑے بھائی نے کہا۔

الگ جا کر اس نے بادشاہ کو سوال کے جواب سے آگاہ کیا۔ بادشاہ بولا۔ ”یہ بالکل درست ہے کہ میں ایک عورت ہوں اور اس لیے میں نے یہ راز کسی کو نہیں بتایا کہ یہ جانتے ہی کہ میں ایک عورت ہوں، دشمن مجھے مار کر میرے ملک پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اب جب کہ تم یہ راز جانتے ہو، کیا تم مجھ سے شادی کرو گے۔“

”نہیں، مجھے اپنی زمین پر واپس جانا ہے کیونکہ میرا نصیبہ جاگ گیا ہے۔ اب میرے زمین زیادہ اناج دے گی۔“

اس عورت نے اسے منانے کی بہت کوشش کی اور بادشاہت کو لالچ بھی دیا لیکن

بڑا بھائی نہ مانا۔ آخر وہاں سے رخصت ہو کر اس گاؤں میں آیا جہاں ایک بوڑھے کسان نے اسے اپنے گھر میں ٹھہرایا تھا۔ کسان اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور پوچھنے لگا:

"کیوں بھائی، میں نے جو سوال کیا تھا اس کا جواب تم نے اپنے نصیبے سے معلوم کیا یا نہیں؟"

"ہاں۔ معلوم کر لیا۔" بڑے بھائی نے جواب دیا۔ "وہ کہتا ہے کہ تمہاری زمین کے اُس حصّے میں جو بنجر پڑا ہے اشرفیوں اور ہیرے جواہرات کا خزانہ دفن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں غلّہ نہیں اُگتا۔ اگر تم زمین کھود کر وہاں سے خزانہ نکال لو تو اس میں فصل کاشت کر سکتے ہو۔"

بوڑھے کسان کو بڑی حیرت ہوئی۔ راتوں رات اس نے بڑے بھائی کو ساتھ لیا اور اپنی زمین کے اس بنجر ٹکڑے پر پہنچ گیا جس میں کبھی کوئی گھاس کا تنکا بھی نہیں

اُگا تھا۔

انہوں نے کُدالیں سنبھالیں اور زمین کھودنی شروع کی۔ خاصی گہرائی میں لوہے کے سات بڑے بڑے صندوق دکھائی دیے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے ساتوں صندوق گڑھے میں سے نکال لیے۔ پھر انہیں کھول کر دیکھا۔ ہر صندوق میں سونے کی اشرفیاں اور ہیرے جواہرات بھرے ہوئے تھے۔ اتنا خزانہ تو سات بادشاہوں کے پاس بھی نہ ہو گا۔

بوڑھے کسان نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہنے لگا۔ ''میرے دوست، اتنی دولت مجھے محض تمہاری مہربانی کے باعث ملی ہے۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ میں اس کا کروں گا۔ تم دیکھتے ہو بڑھاپا مجھے اپنے پنجے میں جکڑ رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ میں سال چھ مہینے اور جیوں گا۔ اس کے بعد اللہ کے پاس چلا جاؤں گا۔ میری ایک ہی جوان بیٹی ہے۔ چاہتا ہوں تم نے جو احسان مجھ پر کیا ہے اس کا بدلہ یوں اُتاروں کہ اپنی بیٹی کی شادی تم سے کر دوں۔ پھر یہ تمام خزانہ تمہارا ہو گا۔''

”نہیں نہیں۔“ بڑے بھائی نے کہا۔ ”مجھے اپنی زمین پر واپس جانا ہے۔ میرا نصیبہ جاگ اٹھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اب میری بنجر اور ناکارہ زمین خوب فصل دے گی۔“

بوڑھے کسان نے بڑے بھائی کو راضی کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر کسان نے مایوس ہو کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔

واپسی میں بڑا بھائی ایک بار پھر اُس گھنے جنگل میں سے گزرا جہاں ایک خون خوار شیر نے اسے پھاڑ کھانے کا ارادہ کیا تھا۔ شیر اسی جگہ بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ فوراً چھلانگیں لگاتا قریب آیا اور کہنے لگا:

”آؤ میاں مسافر۔ میں تو جبھی سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ سُناؤ سفر میں تم پر کیا گزری؟“

بڑے کھانے شیر کو ساری داستان سُنائی اور بتایا کہ کس طرح ایک سلطنت کے بادشاہ نے جو اصل میں عورت تھی، اس سے شادی کی خواہش کی اور کس طرح گاؤں کے بوڑھے کسان کی بنجر زمین میں سے سات صندوق بر آمد ہوئے جن میں سونے کی اشرفیاں اور جواہرات بھرے ہوئے تھے۔ وہ بوڑھا کسان اپنی اکلوتی بیٹی سے میری شادی کر دینے کا خواہش مند تھا، لیکن میں نے بادشاہ اور کسان دونوں سے انکار کر دیا۔ بھلا میں اپنی زمین کیوں چھوڑ دیتا۔ اب تو میرا نصیبہ بھی جاگ اٹھا ہے۔"

شیر نے تمام قصّہ سُننے کے بعد کہا "اور میں نے جو بات تم سے کی تھی کیا اس کا جواب بھی تم نے اپنے نصیبے سے معلوم کیا؟"

"ہاں، اے جنگل کے دلیر بادشاہ۔ میں نے اپنے نصیبے سے تیرے مرض کا علاج پوچھا تھا۔"

”پھر کیا بتایا اس نے؟“ شیر نے جلدی سے پوچھا۔

”وہ کہتا ہے اس مرض کا علاج تو بڑا آسان ہے۔ شیر دے کہہ دینا کہ جب کبھی وہ ایسے آدمی کو دیکھے جو نہایت احمق اور بے وقوف ہو تو اُسے فوراً چیر پھاڑ کر ہڑپ کر جائے۔ ایسا کرنے سے اس کے مرض کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا اور پھر اُسے کبھی بھوک نہیں ستایا کرے گی۔“

یہ جواب سن کر شیر نے چند لمحے غور کیا۔ پھر بولا۔

”اے مسافر، اس دنیا میں تجھ سے زیادہ احمق اور بے وقوف آدمی شاید ہی کوئی اور ہو۔“

یہ کہتے ہی اس نے بڑے بھائی پر حملہ کر کے اسے نیچے گرا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں چند انسانی ہڈیوں، کھال کے بچے ہوئے ٹکڑوں اور کھوپڑی کے سوا کچھ نہ تھا۔

سوداگر کی بیٹی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی شہر میں ایک دولت مند سوداگر رہتا تھا۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی، بہت سمجھ دار اور خوب صورت۔ سوداگر کی بیوی بہت عرصہ ہوا مر چکی تھی اور اب اتنے بڑے گھر میں یہی باپ بیٹی رہا کرتے تھے۔

جب سوداگر کی بیٹی جوان ہوئی تو باپ نے اس کی شادی ایک ایسے آدمی سے کرنی چاہی جو اس سے دگنی عمر کا تھا۔ لڑکی کو ایسے بوڑھے شخص سے شادی کرنا پسند نہ تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ہرگز اس بُڈھے سے شادی نہ کرے گی۔ سوداگر نے بیٹی کو سمجھایا کہ بوڑھا بہت امیر ہے اور اس سے شادی کر لینے کے بعد اس کی تمام جائیداد ہمارے قبضے میں ہو گی۔ مگر لڑکی نے اپنے باپ کی ایک نہ سُنی۔ باپ بڑا لالچی اور پتھر دل تھا۔ اسے بیٹی پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ اس نے بیٹی

کو مکان میں قید کر دیا، جب بھی سوداگر مکان سے باہر جاتا، کمرے کے بڑے دروازے پر تالا ڈال دیتا۔

بہت دن اسی طرح گزر گئے، آخر لڑکی نے اس قید سے آزاد ہونے کی ایک انوکھی تدبیر سوچی۔ اس نے ایک روز باپ سے کہا۔

”ابّا جان، میں آپ کو ناراض کرنا نہیں چاہتی۔ جس بوڑھے شخص سے آپ میری شادی کرنا چاہتے ہیں، میں اسے اس شرط پر اپنا شوہر مان لوں گی کہ آپ میری ایک خواہش پوری کرنے کا وعدہ کریں۔“

لڑکی کی یہ بات سن کر سوداگر نہایت خوش ہوا اور فوراً بول اُٹھا:

”ہاں ہاں بیٹی، میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہوں، بشرطیکہ جہاں میں چاہتا ہوں، وہاں تم شادی کرنے کو تیار ہو جاؤ۔ جلد بتاؤ، تمہاری خواہش کیا ہے؟“

لڑکی نے کہا۔ ”ابا جان، میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے ایک ہزار اشرفیاں دیں تاکہ میں ایک ایسا شمع دان بناؤں جس میں چالیس شمعیں روشن کی جاسکتی ہوں۔“

”ایک ہزار اشرفیاں؟ سونے کا شمع دان؟ باپ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں پیارے ابّا، میں ایسا ہی شمع دان بنوانا چاہتی ہوں۔ مہربان کر کے آج ہی سُنار کو بُلوایئے تاکہ میں اسے ہدایات دے دوں۔“

اُسی دن سوداگر نے ایک ماہر سُنار کو بلایا اور کہا کہ ”جیسا شمع دان میری بیٹی بنوانا چاہتی ہے، جلد سے جلد بنا کر دو۔ اور دیکھو، اُجرت کی فکر نہ کرنا۔ بس چیز میری بیٹی کی پسند کے مطابق ہونا چاہیے۔“ سُنار نے کہا کہ ”جناب آپ فکر نہ کریں۔ ان کی ہدایت کے مطابق ہی کام کروں گا۔“

تب سوداگر کی بیٹی نے سُنار کو ہدایت کی کہ ”جب شمع دان بناؤ تو اس کے اندر اتنی جگہ رکھنا جہاں میں آسانی سے چھُپ سکوں۔ اس میں ایسا دروازہ بھی بنانا جسے میں

اندر ہی سے جب چاہوں کھول لوں، جب چاہوں بند کر دوں۔“

یہ کہہ کر لڑکی نے سنار کو ایک قیمتی ہیرا دیا اور اس سے کہا کہ اس خفیہ دروازے کا ذکر سوداگر سے ہر گز نہ کرنا۔ ایک ہزار سونے کی اشرفیاں اس ہیرے کے علاوہ سُنار کو دی گئیں جنہیں پگھلا کر سونے کا شمع دان اُسے بنانا تھا۔

چند روز بعد سُنار نے سونے کا بہت بڑا اور نہایت خُوب صورت شمع دان سوداگر کے گھر پہنچا دیا۔ لڑکی نے اپنے باپ کی آنکھ بچا کر اس کا خفیہ دروازہ کھولا اور اس میں ایک ہفتے کی خوراک اور پانی کا ذخیرہ چھُپا دیا۔ پھر اگلے روز جب باپ نے بیٹی سے کہا کہ میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی، اب تمہیں بھی اپنے وعدے کے مطابق اس بوڑھے دولت مند سے شادی کر لینے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے تو لڑکی نے گردن جھکالی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ سوداگر نے ان آنسوؤں کا کوئی خیال نہ کیا۔ اس نے سوچا سبھی لڑکیاں ماں باپ کے گھر سے رخصت ہوتے وقت رویا کرتی ہیں۔ وہ اسی وقت اُٹھ کر اس بوڑھے کو اِطّلاع

دینے گیا کہ شادی کا انتظام کرو۔

باپ کے باہر جاتے ہی لڑکی نے اپنے جوتے اتار کر مکان کے اندر بنے ہوئے کنویں کی منڈیر پر رکھے اور خود شمع دان کا دروازہ کھول کر اس کے اندر چھُپ گئی۔ باپ شام کو واپس آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، بیٹی کا کہیں نشان نہ پایا۔ مکان کا چپّا چپّا، گوشہ گوشہ چھان مارا، لیکن بے سود۔ آخر اس کی نگاہ کنویں کی منڈیر پر پڑے ہوئے جوتوں کی طرف گئی۔ وہ ایک دم دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس نے سمجھا لڑکی شادی کے خوف سے کنویں میں ڈوب کر مر گئی۔

"ہائے میرا بڑا غرق ہو۔" اس نے اپنے سینے پر دوہتّڑ مارتے ہوئے کہا۔ "میں ہی اپنی بیٹی کا قاتل ہوں۔ اُسے میں نے ہی کنویں میں ڈوب جانے پر مجبور کیا ہے۔ اگر وہ اس بُڈّھے امیر سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی تو کیا ہرج تھا۔ میں اس کی شادی کسی نوجوان سے کر دیتا۔ ہائے، ہائے۔ یہ سب میرے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔

دیر تک آنسو بہانے کے بعد وہ چپ ہوا۔ پھر اسے اِحساس ہوا کہ اگر شہر کے کوتوال کو پتا چل گیا کہ اس کی بیٹی نے کنویں میں کود کر خودکُشی کر لی ہے اور پولیس کے سپاہیوں نے آن کر لاش کنویں میں سے نکال لی تو نہ صرف شہر بھر میں سخت بدنامی ہو گی، بلکہ ہو سکتا ہے بادشاہ اُسے قید کی سزا بھی دے دے۔ لہٰذا خاموش ہو رہنا ہی بہتر ہے، اگر کوئی بیٹی کے بارے میں پوچھے گا بھی تو کہہ دوں گا کہ وہ اپنی پھوپھی کے پاس دوسرے شہر میں چلی گئی ہے۔

لیکن سوداگر کی خوش قسمتی کہ کسی نے بھی اس کی بیٹی کے یُوں گُم ہو جانے کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ مگر سوداگر کے دل پر ایسا صدمہ تھا کہ جوں ہی وہ اپنے کام کاج سے فُرصت پا کر گھر میں داخل ہوتا، پیاری بیٹی کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی اور وہ منہ چھپا کر دیر تک چُپکے آنسو بہاتا رہتا۔ سونے کا وہ بڑا سا شمع دان سوداگر کے رنج میں اور اضافہ کرتا۔ کس شوق سے پیاری بیٹی نے یہ شمع دان بنوایا تھا اور اسے ایک دفعہ بھی اس میں شمعیں روشن کرنا نصیب نہ ہوا، یہ سوچ کر سوداگر کی ہچکی بندھ جاتی۔

آخر اس نے فیصلہ کیا کہ شمع دان سُنار کو واپس کر دے اور اس سے کہے کہ اسے بیچ کر جو قیمت ملے، وہ مجھے دے دے۔ شمع دان نہایت خُوب صورت اور قیمتی تھا، سُنار خوشی خوشی اُسے اُٹھوا کر اپنی دُکان میں لے گیا اور شیشے کی ایک الماری بنوا کر اس میں سجا دیا۔ اسی روز بادشاہ کا بیٹا گھوڑے پر سوار ہو کر صرافہ بازار میں کچھ زیور خریدنے آیا۔ ان دنوں اس کی شادی ہونے والی تھی اور وہ اپنی ہونے والی دلہن کے لیے اپنی پسند کے زیور خریدنا چاہتا تھا۔

سونے کے اس شمع دان پر شہزادے کی نگاہ پڑی تو وہ بہت خوش ہوا۔ ایسا شمع دان تو شاہی محل میں بھی نہ تھا جس میں چالیس شمعیں روشن ہوں۔ شہزادے نے مُنہ مانگی قیمت دے کر شمع دان خریدا اور اپنے غلاموں کو حکم دیا کہ اسے احتیاط سے محل میں لے جاؤ اور خاص اُس کمرے میں سجادو جہاں ہم سویا کرتے ہیں۔

غُلاموں نے شمع دان لے جا کر شہزادے کی شان دار خوابگاہ میں مسہری کے نزدیک ہی سجا دیا۔ اس شمع دان کے آنے سے خوابگاہ کی شان ہی دو بالا ہو گئی۔

شہزادہ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

شہزادے کی عادت تھی کہ وہ صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا اپنی خواب گاہ ہی میں کھایا کرتا تھا۔ جس روز شمع دان اس کے کمرے میں رکھا گیا، اس روز اس نے محسوس کیا کہ جو کھانا سونے چاندی کے برتنوں میں اس کے لیے لا کر رکھا گیا تھا، اس میں سے کئی پلیٹیں خالی پڑی ہیں۔ پھل بھی پہلے سے کم دکھائی دیتے ہیں اور ایک دو روٹیاں بھی غائب ہیں۔ شہزادہ حیران تو ہوا لیکن اس نے کسی سے کچھ کہا نہیں۔ مگر جب صبح ناشتے پر بھی ایسا ہی ہوا کہ دودھ کا پورا بھرا ہوا گلاس آدھا رہ گیا اور چار اُبلے ہوئے انڈوں میں سے صرف دو باقی رہ گئے اور ناشتے کے تین سیبوں میں سے ایک غائب ہوا تو شہزادے نے ناشتا لانے والے غلام سے پوچھا کہ یہ گڑبڑ کس نے کی ہے؟ غلام سخت خوفزدہ ہوا اور اس نے ادب سے کہا۔

”عالی جاہ، آپ کے ناشتے یا کھانے میں گڑبڑ کرنے کی بھلا کسے جرأت ہو سکتی ہے۔ ضرور یہ کسی آسیب کا کام ہے۔“

"آسیب"شہزادہ چلّایا"آسیب کہاں سے آگیا۔پہلے تو کبھی ایسی شکایت دیکھی نہ سُنی۔خیر آیندہ خیال رکھا جائے۔"

لیکن ساری تدبیریں ناکام ہوتی رہیں، ہر رات اور ہر صبح شہزادے کے ناشتے اور کھانے میں سے ایک آدھ روٹی، ایک آدھ پھل یا انڈا ضرور غائب ہو جاتا اور کبھی کبھی تو دودھ سے بھرا ہوا پورا گلاس خالی ہی ملتا۔ شہزادہ غلاموں پر ناراض ہوتا، انہیں سزا دینے کی دھمکی دیتا، مگر روزانہ ایسی ہی پراسرار شرارتیں ہوتی رہیں۔

ایک روز سے شہزادے کی آنکھ کھلی اور غلام اس کے سامنے ناشتا لے کر آیا تو شہزادے نے دیکھا کہ پلیٹوں میں ہر چیز صحیح اور پوری ہے، اس نے غلام کو حکم دیا کہ ناشتا میز پر رکھ کر چلا جائے۔ اس کے بعد اس نے غسل خانے میں جا کر ہاتھ مُنہ دھویا اور پھر اپنی خواب گاہ میں آیا۔ آتے ہی اس کی نظر ناشتے کے برتنوں پر پڑی۔ حیرت سے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ شاید غلام

ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ضرور اس کمرے میں کسی بھوت پریت نے ڈیرا جما لیا ہے۔ ناشتے میں سے چیزیں غائب کر دینا اسی کی حرکت ہے۔

شہزادے نے دیکھا کہ چار انڈوں میں سے ایک انڈا اندارد ہے۔ دودھ کا گلاس آدھا رہ گیا ہے اور دو سیب بھی غائب ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو ڈر کر اس کمرے ہی کو خالی کر دیتا اور اس میں اکیلے سونے کا خیال ہی نہ لاتا۔ لیکن وہ بڑا بہادر شہزادہ تھا۔ اس نے سوچا یہ کیسا بھوت ہے جو ہم انسانوں کی طرح ناشتے اور کھانے کا شوق رکھتا ہے۔ اسے پکڑنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ ایک رات جاگ کر کاٹے گا اور دیکھے گا کہ یہ پراسرار بھُوت آتا کدھر سے ہے!

وہ جھوٹ موٹ اپنی مسہری پر لیٹ کر سو گیا۔ آدھی رات ہوئی تو اس کے کان میں عجیب سی آواز آئی۔ اس نے آہستہ سے گردن موڑ کر سرہانے کی طرف دیکھا۔ سونے کے شمع دان میں ایک شِگاف بن رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس شگاف میں سے ایک نہایت خوب صورت لڑکی باہر نکلی۔ اس نے سوئے ہوئے

شہزادے کو ایک نظر دیکھا، پھر اس میز کی طرف دبے پاؤں بڑھی جس پر شہزادے کے لیے رات کا کھانا چُنار کھا تھا اور جو شہزادے نے جان بوجھ کر نہیں کھایا تھا۔

لڑکی کرسی پر بیٹھ گئی اور جلدی جلدی کھاتا ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔ شہزادہ کبھی کبھی آنکھیں کھول کر لڑکی کو دیکھ لیتا۔ تھوڑی دیر میں لڑکی نے اپنا پیٹ بھر لیا۔ پھر دبے پاؤں شمع دان کی جانب آئی اور اس میں داخل ہوا ہی چاہتی تھی کہ شہزادے نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لڑکی کے حلق سے چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو گی۔

شہزادے نے اسے اٹھا کر مسہری پر ڈالا، منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ لڑکی ہوش میں آئی تو ڈری ڈری نظروں سے شہزادے کو تکنے لگی۔

”کون ہو تم؟“ شہزادے نے پوچھا۔ ”کوئی روح، پری یا آدمیوں کی طرح اس دنیا میں رہنے والی ایک لڑکی؟“

”میں ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں۔“ لڑکی نے روتے ہوئے جواب دیا اور پھر شہزادے کو اپنی دکھ بھری کہانی کہہ سُنائی۔ شہزادے کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اسے یہ لڑکی بہت پسند آئی تھی۔ اس نے دل میں سوچا، کیا ہی اچھا ہو اگر اس لڑکی سے میری شادی ہو جائے۔ لیکن یہ بات ابھی اس نے دل ہی میں رکھی۔

شہزادے نے سوداگر کی بیٹی کو اُسی شمع دان میں چھُپائے رکھا۔ جب ساری دنیا نیند کے مزے لینے لگتی تو لڑکی باہر نکلتی اور شہزادے سے باتیں کرتی رہتی۔ پھر جوں ہی مشرق سے سورج کی پہلی کرن کمرے میں جھانکتی، وہ دوبارہ شمع دان میں داخل ہو جاتی۔

ایک رات جب کہ شہزادہ اور سوداگر کی بیٹی آپس میں باتیں کر رہے تھے، اچانک

ایک کنیز محل کے اُس حصّے سے گزری جہاں شہزادے کی خواب گاہ تھی۔ اس کے کانوں میں باتیں کرنے کی آواز آئی تو وہ ایک دم رُکی اور سوچنے لگی کہ شہزادہ اپنی خواب گاہ میں اکیلا سوتا ہے، اس وقت وہاں دوسرا کون ہے۔ یہ سوچ کر وہ دبے پاؤں شہزادے کی خواب گاہ کے قریب گئی اور دروازے کے ایک سوراخ سے جھانکنے لگی۔

یہ دیکھ کر اس کے تعجّب کی حد نہ رہی کہ شہزادے کی مسہری کے نزدیک کرسی پر ایک نہایت خوب صورت لڑکی بیٹھی ہے دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ یہ تماشا دیکھ کر کنیز کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ اس نے اسی وقت دوسری کنیز کو خبر کی۔ دوسری نے تیسری سے ذکر کیا، اور تیسری نے چوتھی کے کان میں پھُونکا۔ غرض صبح ہوتے ہوتے یہ خبر تمام محل میں مشہور ہو گئی۔ آخر ہوتے ہوتے اس شہزادی نے بھی سُن گُن پالی جس کی شہزادی شہزادے سے ہونے والی تھی۔

یہ خبر سنتے ہی شادی حسد کے مارے جل بھُن گئی اور انگاروں پر لوٹنے لگی، اس نے چُپکے سے ایک کنیز کو اپنے پاس بلایا اور انعام کا لالچ دے کر کہنے لگی:

"اگر تو مجھے اس لڑکی کے بارے میں یہ معلوم کر کے بتا دے کہ وہ شہزادے کی خواب گاہ میں کیسے آتی ہے اور کہاں واپس جاتی ہے تو تجھے مُنہ مانگا انعام دوں گی۔"

کنیز بہت مکّار اور چالاک تھی۔ اس نے شہزادی سے وعدہ کیا کہ ایک دو روز میں اچھی طرح سراغ لگا کر اِطّلاع دے گی۔

اُس دن سے کنیز شہزادے کی خواب گاہ کے آس پاس پھرتی رہی۔ جب آدھی رات قریب آئی تو وہ بلّی کی طرح پنجوں کے بل چلتی ہوئی شہزادے کی خواب گاہ کے پاس پہنچی اور دروازے کے سوراخ سے آنکھ لگا کر جھانکنے لگی۔

اس نے دیکھا کہ چند لمحے بعد سونے کے شمع دان میں بنا ہوا ایک خُفیہ دروازہ کھلا

اور اُس کے اندر سے وہی حسین لڑکی نکل آئی۔ اس نے باہر نکلتے ہی پہلے تو کھانا کھایا، پھر کرسی پر بیٹھ کر شہزادے سے باتیں کرنے لگی۔ کنیز برابر دروازے سے آنکھ لگائے کھڑی دیکھتی رہی۔ جوں ہی مشرق میں اُجالا پھیلا اور مرغ اذانیں دینے لگے، وہ لڑکی کُرسی سے اُٹھی، شمع دان میں داخل ہوئی اور کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

کنیز دوڑی دوڑی گئی، شہزادی کو سارا قصّہ نمک مرچ لگا کر سنایا اور اپنا انعام طلب کیا۔ شہزادی نے انعام دینے کے بجائے ایک چانٹا کنیز کے منہ پر مارا اور ناراض ہو کر بولی:

”دفع ہو جا کم بخت میرے سامنے سے۔ بھلا یہ بھی کون ایسی انوکھی خبر ہے جس پر میں تجھے انعام دوں گی؟“

کنیز اپنا سا مُنہ لے کر چلی گئی۔ اس کے سوا اور کرتی بھی کیا؟ اِدھر شہزادی نے

مکّاری سے کام لیتے ہوئے ایک عجب تدبیر سوچی۔ ایک دن اس نے سنا کہ شہزادہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شکار کھیلنے کے لیے جنگل کی طرف جا رہا ہے۔ شہزادی کو اس خبر کا بے چینی سے انتظار تھا۔ شہزادے کے روانہ ہوتے ہی اس نے اپنا ایک غلام شاہی محل میں ملکہ کے پاس بھیجا۔ اس غلام نے یہ پیغام دیا کہ آج رات شہزادی کی چند سہیلیاں ایک دعوت میں آنے والی ہیں اور شہزادی کو اپنا کمرا روشن کرنے کے لیے ایک بڑے لیمپ کی ضرورت ہے۔ اس نے سنا ہے کہ شہزادے کی خواب گاہ میں سونے کا ایک بڑا لیمپ موجود ہے۔ نہایت مہربانی ہو اگر یہ لیمپ ایک رات کے لیے دے دیا جائے۔

ملکہ یہ پیغام سُن کر سوچ میں پڑ گئی۔ اصل میں شہزادہ شکار پر جانے سے پہلے سب کو منع کر گیا تھا کہ کوئی غلام یا کنیز اس کی خواب گاہ میں داخل نہ ہو۔ وہاں رکھی ہوئی کسی بھی چیز کو ہرگز نہ چھیڑا جائے اور سونے کا وہ شمع دان جس جگہ رکھا ہے، وہیں رہنے دیا جائے۔ جب غُلام نے جواب مانگا تو ملکہ نے کہا کہ وہ لیمپ نہیں دیا جاسکتا۔ یہ سن کر شہزادی روتی ہوئی بادشاہ کے پاس گئی اور کہنے لگی۔

”جہاں پناہ، دیکھیے میری اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کی جا سکتی۔ حال آں کہ کچھ عرصے بعد میری شادی شہزادے سے ہو جائے گی۔ پھر خود بخود اس کی ہر چیز مالک بن جاؤں گی۔ مجھے صرف ایک رات کے لیے سونے کے شمع دان کی ضرورت ہے اور وعدہ کرتی ہوں کہ صبح ہوتے ہی واپس شہزادے کی خواب گاہ میں بھجوادوں گی۔

بادشاہ سلامت نے غلاموں کو حکم دیا کہ شمع دان شہزادے کے کمرے سے اٹھا کر شہزادی کے پاس پہنچا دیا جائے۔ بادشاہ کا حکم کون ٹال سکتا تھا۔ اسی وقت شمع دان شہزادی کے پاس پہنچ گیا۔ مکّار شہزادی نے اپنے کمرے میں شمع دان رکھوایا اور چالیس کی چالیس شمعیں ایک دم جلا دیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ان جلتی ہوئی شمعوں کی گرمی سے شمع دان کا اندر کا حصّہ تپنے لگا۔ بے چاری سوداگر کی لڑکی نے جل جانے کے خوف سے مجبور ہو کر دروازہ کھولا اور باہر نکل کر بھاگی، لیکن زیادہ دور نہ جا سکی اور وہیں کمرے کے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

شہزادی نے قریب جا کر دیکھا۔ وہ سمجھی لڑکی مر چکی ہے۔ اُسی وقت اس نے اپنے حبشی غلام کو طلب کیا اور کہنے لگی۔

"دیکھو، اس مری ہو لڑکی کو کسی کپڑے میں باندھو اور قلعے کے باہر پانی سے بھری ہوئی خندق میں پھینک دو۔ خبردار! کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

غلام نے سوداگر کی بیٹی کو کپڑے میں اچھی طرح لپیٹا، اس کا پُشتارہ سا بنا کر کندھے پر ڈالا اور پانی سے بھری ہوئی گہری خندق میں پھینک کر واپس آ گیا۔

ادھر پانی میں گرتے ہی سوداگر کی بیٹی کو ہوش آ گیا۔ اس نے جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور مدد کے لیے پکارنے لگی۔ خدا کی قدرت، ادھر سے ایک بوڑھے ماہی گیر کا گزر ہوا۔ اس نے لڑکی کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنیں اور خندق کی طرف دیکھا تو لڑکی ڈوبتی نظر آئی۔ بوڑھے مچھیرے نے خندق میں چھلانگ لگائی۔ وہ بہترین تیراک تھا۔ لپکا ہوا گیا اور سوداگر کی بیٹی کو گھسیٹ کر

خندق کے کنارے لے آیا۔ پھر اُسے اپنے گھر لے گیا اور حال احوال پوچھا مگر اس نے صرف اتنا کہا کہ بابا، میں ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں اور میرا ٹھکانا کوئی نہیں۔ آج سے میں آپ کی بیٹی ہوں۔

سوداگر کی بیٹی بوڑھے ماہی گیر کے گھر رہنے لگی۔ شہزادے کا قصّہ سُنیے کہ جب وہ شکار کھیل کر محل میں واپس آیا تو اس پر کیا بیتی۔ اس نے دیکھا کہ سونے کا شمع دان اپنی جگہ بدستور رکھا ہے، مگر اس کا خفیہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور لڑکی غائب ہے۔ یہ دیکھ کر شہزادے کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی اس نے غضب ناک ہو کر لونڈی غلاموں سے پوچھا کہ سچ سچ بتاؤ، اس کو کس نے ہاتھ لگایا تھا۔ لیکن کسی نے اسے کچھ نہ بتایا۔ سب یہی کہتے رہے کہ حضور، ہم نے آپ کے شمع دان کو ہرگز ہاتھ نہیں لگایا۔ آخر پریشان ہو کر شہزادہ اپنے کمرے میں گیا اور مسہری پر لیٹ کر خوب رویا۔ اُس دن سے اس نے کھانا پینا، سیر تفریح، ہنسنا بولنا سب چھوڑ دیا۔ روز بروز اس کی حالت بگڑتی گئی اور وہ چند ہی دن میں یوں دکھائی دینے لگا جیسے برسوں کا بیمار ہو۔

بادشاہ اور ملکہ اپنے پیارے بیٹے کی بڑھتی ہوئی حالت دیکھ کر سخت پریشان تھے۔ ملک بھر کے حکیموں اور طبیبوں اور سیانوں کو بُلا کر شہزادے کا علاج کرایا گیا، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اگر شہزادے نے ایک دو دن اور کچھ نہ کھایا پیا تو اس کی جان بچنی سخت مشکل ہے۔ اُسے کھلانے پلانے کی ہزار کوششیں کی گئیں، مگر کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔

بادشاہ کا ایک وزیر بڑا دانا اور عقل مند تھا۔ اس نے بادشاہ سے کہا۔ ”جہاں پناہ! ایک تدبیر اس غلام کے ذہن میں آئی ہے جس پر عمل کیا جائے تو ممکن ہے ہم شہزادے کو کچھ کھلانے پلانے میں کام یاب ہو سکیں۔

”جلد بیان کرو، وہ تدبیر کیا ہے؟“ بادشاہ نے خوش ہو کر کہا۔

”وہ تدبیر یہ ہے عالی جاہ کہ تمام سلطنت میں منادی کروا دی جائے کہ ہر شخص خواہ بچّہ ہو یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت اپنے شہزادے کی جان بچانے کے لیے

کھانے یا پینے کی کوئی چیز تیّار کرے اور محل میں لے کر آئے۔ ہو سکتا ہے اپنی رعایا کی یہ محبّت دیکھ کر شہزادہ فاقہ توڑنے پر مجبور ہو جائے۔"

بادشاہ کو یہ تدبیر پسند آئی۔ اسی دن تمام سلطنت میں منادی کرادی گئی اور گلی گلی، کوچے کوچے ڈھنڈورچیوں نے ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ حکم خُدا کا، ملک بادشاہ کا۔ تمام لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ شہزادے کی جان بچانے کے لیے کھانے پکائیں۔ اور خود لے کر محل میں حاضر ہوں، شاید کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا شہزادے کو پسند آئے اور وہ اسے کھا کر اپنا فاقہ توڑ دے۔

رعایا کو شہزادے سے بہت محبت تھی، اور سبھی اس کی بیماری سے فکر مند تھے۔ یہ اعلان سنتے ہی کیا عورت، کیا مرد، سب کھانا پکانے میں لگ گئے۔ ہر شخص کی کوشش یہ تھی کہ اس کا کھانا سب سے عمدہ اور لذیذ ہو۔ کسی نے زردہ پکایا، کوئی پُلاؤ کی رکابی لے کر شاہی محل کی طرف روانہ ہوا، کسی نے شاہی ٹکڑے پکائے۔ کوئی قورمہ اور متنجن لے کر گیا، کسی نے صرف ماش کی دال پکائی۔ غرض ہزارہا

کھانے نِت نئے اور ایک سے ایک نرالے تیار ہونے لگے۔ لیکن شہزادہ بھی ہٹ کا پکا تھا، کیا مجال جو اس نے کسی کھانے کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔

ایک دن بوڑھے ماہی گیر سے سوداگر کی بیٹی نے کہا:

"بابا جان، شہر کے سب لوگ شہزادے کے لیے طرح طرح کے کھانے پکوا کر لے جا رہے ہیں، آپ بھی کچھ لے جائیے۔ اگر کہو تو میں مچھلی کا شوربا بنا دوں؟"

ماہی گیر نے ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا ہے۔ "بیٹی، ہمارے نصیب ایسے کہاں کہ شہزادہ ہمارے گھر کا پکا ہوا شوربا قبول کرے۔ بڑے بڑے امیروں، رئیسوں اور وزیروں کے گھر سے لذیذ کھانے پک کر شہزادے کے لیے لے جائے جا رہے ہیں۔ اور وہ انہیں آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ بھلا ہمارے شوربے کو کون پوچھے گا۔"

"آپ لے کر تو جائیں بابا جان۔ کیا خبر شہزادے کو مچھلی کا شوربا پسند ہی آ

جائے۔" لڑکی نے کہا۔

"اچھا بیٹی، تو پھر پکا دو۔ مچھلی کا شوربا۔"

سوداگر کی بیٹی نے بڑی محنت سے مچھلی کا نہایت مزے دار شوربا بنایا اور مٹی کے ایک پیالے میں بھر کر ماہی گیر کو دیا کہ ابھی اسے لے جایئے اور شہزادے کی خدمت میں پیش کیجیے۔ چلتے وقت سوداگر کی بیٹی نے چپکے سے ایک انگوٹھی شوربے میں ڈال دی۔ یہ انگوٹھی شہزادے کی تھی جو اس نے ایک دن سوداگر کی بیٹی کو تحفے میں دی تھی۔

بوڑھا مچھیرا شوربے کا پیالہ لے کر شاہی محل کی جانب روانہ ہوا تو لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا، طعنے دیے، پھبتیاں کسیں، فقرے جڑے۔ کسی نے کہا:

"لو، اس بُڈھے کی عقل ماری گئی ہے کہ بدبُو دار مچھلی کا شوربا مٹی کے پیالے میں انڈیل کر شہزادے کے لیے لے چلا ہے۔"

دوسرے نے آواز لگائی۔ ”بڑے میاں، اس گستاخی پر سُولی پر لٹکا دیے جاؤ گے، سولی پر۔ شوربا لے جانا ہی تھا تو کسی عمدہ سے برتن میں لے جاتے۔“

تیسرے نے قہقہہ لگا کر کہا:

”شاید بڑے میاں کو کچھ انعام ملنے کی امید ہو گی۔ ارے یہیں سے واپس چلے جاؤ۔ کیوں اپنی مٹّی پلید کراتے ہو۔“

چوتھا بولا۔ ”چلے ہیں شہزادے کے لیے مچھلی کا شوربا لے کر جیسے وہ انہی کے شوربے سے اپنا فاقہ توڑے گا۔ ارے بیوقوف بُڈھے! شہزادے نے بڑے بڑے امیروں اور وزیروں کے گھر کا کھانا تو قبول کیا نہیں، تجھے کون گھاس ڈالے گا۔“

غرض شاہی محل تک یوں ہی لوگوں نے آوازے کسے اور ماہی گیر کا خوب مذاق اُڑایا۔ وہ بے چارہ بھی سوچتا کہ واقعی میری یہ اوقات کہاں کے شہزادے کے

حضور یہ شوربا لے جاؤں۔ کئی دفعہ دل میں خیال آیا کہ یہیں سے الٹے قدموں گھر چلا جاؤں۔ مگر پھر لڑکی کے بارے میں سوچتا کہ اس نے کتنے چاؤ سے شہزادے کے لیے شوربا تیار کیا ہے۔ اگر میں واپس گیا تو اُس کا ننھا سا دل ٹوٹ جائے گا۔ ہاں، اگر شہزادے نے تحفہ قبول نہ کیا تو پھر میرا کیا قصور۔ اسی طرح کی باتیں دل سے کرتا بوڑھا مچھیرا آخر کار شاہی محل میں داخل ہو ہی گیا۔

بادشاہ کی جانب سے عام اجازت تھی کہ جو شخص بھی شہزادے کے لیے کھانا لے کر آئے، اسے مت روکو۔ دربانوں اور غلاموں نے جھٹ پٹ مچھیرے کو شہزادے کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ شہزادے نے ایک نگاہ بوڑھے ماہی گیر پر ڈالی، اور پھر نجانے کیا ہوا کہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے حکم دیا کہ بوڑھے کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا جائے۔ غلاموں نے پیالہ ماہی گیر سے لے کر شہزادے کو دے دیا۔

"کیسی عمدہ خوش بو ہے اس شوربے کی۔" شہزادے نے کہا اور مزے لے لے

کر پینا شروع کر دیا۔ سب حیران پریشان تھے کہ بوڑھے کی قسمت خوب جاگی۔ شہزادے نے فٹافٹ سارا شوربا پی لیا اور اب جو پیالے کی تہہ میں نگاہ پڑی تو اپنی وہی انگوٹھی دکھائی دی جو شمع دان والی لڑکی کو دی تھی۔

انگوٹھی کو دیکھتے ہی شہزادہ اُچھل پڑا۔ یوں لگا جیسے جان میں جان آ گئی ہو۔ اس نے بے تابی سے بوڑھے ماہی گیر کا ہاتھ پکڑا، اسے ایک طرف لے گیا اور بولا:

"بڑے میاں، جلدی بتاؤ یہ شوربا کس نے پکایا تھا؟"

تب ماہی گیر نے شہزادے کو شروع سے آخر تک سارا قصّہ سُنایا کہ کس طرح قلعے کی خندق میں سے اس نے ایک ڈوبی ہوئی لڑکی کو بچایا۔ پھر اُسے گھر لے گیا اور اپنی بیٹی بنا کر رکھا۔ یہ شوربا اُسی لڑکی نے تیار کیا ہے۔

شہزادے نے اسی وقت دربار کے امیروں اور وزیروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیگموں کو بوڑھے ماہی گیر کے گھر بھیجیں اور نہایت عزّت سے اس کی بیٹی کو شاہی

محل میں لے آئیں۔

شہزادے کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ سوداگر کی بیٹی شاہی محل میں پہنچا دی گئی۔ شہزادے نے اس سے تمام حالات معلوم کیے۔ اس نے رو رو کر اپنی داستان سُنائی۔ بادشاہ کو بھی اِن واقعات کا پتا چل گیا۔ اس نے حکم دیا کہ مکّار شہزادی سے شہزادے کی منگنی توڑ دی جائے۔

تیسرے روز شہزادے اور سوداگر کی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ تمام سلطنت میں چراغاں کیا گیا، گانے بجانے کی محفلیں ہوئیں، جابجا آتش بازی چھوڑی گئی، غریبوں میں کھانا تقسیم کیا گیا۔

بوڑھے ماہی گیر کو شہزادے نے اپنے محل میں ایک شان دار اور سجا سجایا کمرا رہنے کے لیے دیا اور وہیں اس نے اپنی باقی عمر خدا کی عبادت میں کاٹ دی۔

مکّار وزیر

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ملک یمن میں ایک دولت مند آدمی رہتا تھا۔ اس کا نام تھا خواجہ بشیر۔ خواجہ بشیر نہایت عقل مند، پڑھا لکھا اور خوش اخلاق تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا آنا جانا بادشاہ کے دربار میں ہو گیا اور بادشاہ بھی اس کو پسند کرنے لگا، کیوں کہ وہ ہمیشہ بادشاہ کو اچھی اچھی باتیں بتایا کرتا اور رعایا کی خوش حالی اور بہتری کی تدبیریں سمجھایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ بادشاہ کو خواجہ بشیر پر اتنا بھروسا ہو گیا کہ کسی امیر وزیر پر اتنا بھروسہ نہ تھا۔

بادشاہ کو جب بھی کوئی مشکل در پیش ہوتی، وہ سب سے پہلے خواجہ بشیر سے مشورہ کرتا۔ ہمیشہ ہی بادشاہ نے محسوس کیا کہ خواجہ کا مشورہ بہت کار آمد ہوتا ہے۔ بادشاہ نے محل کے پہرے داروں، سپاہیوں اور غلاموں کو حکم دے رکھا تھا کہ

خواجہ بشیر جب چاہے، شاہی محل میں آ سکتا ہے۔ اسے بالکل نہ روکا جائے اور سب اس سے عزت و احترام سے پیش آئیں۔

یہ صورتِ حال بادشاہ کے وزیر کو ناگوار گزرتی تھی۔ بادشاہ کا وزیر ایک مکار اور کینہ پرور شخص تھا۔ اسے یہ بات بالکل اچھی نہ لگتی تھے کہ بادشاہ اپنے وزیر کے بجائے خواجہ بشیر پر اعتماد کرتا ہے اور اس سے تمام معاملات میں مشورہ کرتا ہے۔ اس نے سوچا کی کسی طرح بادشاہ کے دل میں خواجہ بشیر کے خلاف نفرت پیدا کرنی چاہیے۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے بادشاہ کے کان خواجہ بشیر کے خلاف بھرنے کا منصوبہ بنایا۔

ایک دن جب بادشاہ اکیلا تھا، مکار وزیر اس کے پاس گیا اس سے کہا۔

”بادشاہ سلامت کا اقبال بلند ہو اور آپ کا سایہ ہم پر ہمیشہ قائم رہے۔ سلطنت کو روز بروز ترقّی نصیب ہو اور تخت و تاج کی عظمت بر قرار رہے۔ یہ غلام بہت دن

سے ایک خاص معاملے میں پریشان ہے اور حضور سے اسی سلسلے میں کچھ عرض کرنے کا خواہش مند ہے۔ اگر اجازت عطا فرمائی جائے تو عرض کروں۔"

"اجازت ہے۔" بادشاہ نے کہا۔

مکّار وزیر نے کہا۔ "عالی جاہ، دو باتیں ایسی ہیں جو سلطنت کے لیے خرابی کا باعث بن سکتی ہیں، اور ان سے خود حضُور کا تخت و تاج بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ حضُور پہلی بات یہ ہے کہ جو لوگ واقعی عزّت اور احترام کے حق دار ہوں، انہیں وہ عزّت نہ دی جائے اور ان کا احترام نہ کیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ جو لوگ ادنیٰ درجے کے ہوں اور اس قابل نہ ہوں کہ انہیں بادشاہ مُنہ لگائے، ان لوگوں کو نچلے درجے سے اُٹھا کر اوپر پہنچا دیا جائے۔ بادشاہ انہیں اپنے قریب بٹھانے لگے اور ہر معاملے میں ان ہی سے مشورہ کرنے لگے۔ یہ لوگ چوں کہ ادنیٰ ذہن کے ہوتے ہیں، اس لیے ان سے کسی اچھے مشورے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

"ہم سمجھے نہیں۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔" بادشاہ نے پریشان ہو کر کہا۔ "ذرا کھل کر بات کرو۔"

"حضُور، گُستاخی معاف۔ میرا اشارہ خواجہ بشیر کی طرف ہے جسے حضُور نے خواہ مخواہ عزّت دار بنا دیا ہے اور ہر معاملے میں جب تک خواجہ بشیر آپ کو مشورہ نہ دے، آپ اس پر عمل نہیں فرماتے۔ شاید جہاں پناہ کو معلوم نہیں کہ یہ شخص بہت چالاک، مکّار اور دھوکے باز ہے۔ شہر کا بچّہ بچّہ اس کی بدمعاشیوں سے واقف ہے۔ آپ تو خود سوچ سکتے ہیں کہ خواجہ بشیر جیسا بدنام آدمی آپ کا مصاحب ہو تو رعایا پر کتنا بُرا اثر پڑ سکتا ہے۔"

بادشاہ نے بڑے غور سے وزیر کی یہ تقریر سُنی اور پھر کہا۔ "یہ تم کیا کہتے ہو؟ کیا ہم اتنی عقل بھی نہیں رکھتے کہ اچھّے بُرے اور ادنیٰ و اعلیٰ آدمی میں تمیز کر سکیں۔ جہاں تک ہم نے جانچا اور پرکھا ہے، خواجہ بشیر نہایت نیک، عقل مند اور دیانت دار شخص ہے اور ہمیں اس پر پورا پورا بھروسا ہے۔ آج تک اس نے جتنے

بھی مشورے ہمیں دیے، وہ سب درست اور مفید ثابت ہوئے۔ ہم نے کئی بار اس کی آزمائش کی ہے اور ہر دفعہ اسے کھرا اور سچّا انسان پایا ہے۔ تم نے اس کے خلاف جو الزامات لگائے ہیں اب تمہارا فرض ہے کہ انہیں صحیح ثابت کرو، ورنہ ہم تمہیں ایسی عبرت ناک سزا دیں گے کہ ہمیشہ یاد رکھو گے۔"

یہ سُنتے ہی وزیر کا خُون خشک ہو گیا۔ دہشت سے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ فوراً جھُک کر بادشاہ کے قدموں کو بوسہ دیا اور سات سلام کر کے رُخصت ہوا۔

وزیر ہانپتا ہانپتا اپنے مکان پر پہنچا اور ٹھنڈے پانی کے کئی پیالے پیے، تب کہیں اوسان بحال ہوئے۔ اپنے آپ سے کہنے لگا، چلے تھے نماز بخشوانے، اُلٹے روزے گلے پڑ گئے۔ مجھ کم بخت کو کیا خبر تھی کہ خواجہ بشیر نے بادشاہ پر ایسا جادو کر رکھا ہے کہ اس کے خلاف کچھ سُننے کے لیے تیّار ہی نہیں۔ اب اگر میں خواجہ بشیر کے بارے میں الزام ثابت نہ کر سکا تو بادشاہ مجھے جیتا نہ چھوڑے گا اور کیا

عجب میر ازن بچّہ کو لہو میں پِلوا دے۔

جوں جوں وزیر اس معاملے پر غور کرتا، توں توں اسے اپنی ہی جان کے لالے پڑتے نظر آتے۔ اب اس نے دماغ لڑانا شروع کیا کہ وہ کون سی تدبیر ہو سکتی ہے جس کے ذریعے خواجہ بشیر کو بادشاہ کی نگاہوں سے ِگرایا جائے۔ سوچتے سوچتے شیطان نے آخر کار اس کے کان میں ایک تدبیر پھونک ہی دی۔

اُس شہر میں سترّ اسّی برس کی ایک بڑھیا رہتی تھی۔ مکّاری اور چالاکی میں لا جواب۔ اگر کہو تو آسمان سے تارے توڑ لائے۔ سب اُسے پھاپھا کُٹنی کہتے، اس کے کاٹے کا منتر ہی نہ تھا، وزیر نے اپنا ایک آدمی بھیج کر اِس کُٹنی کو بُلایا۔ وہ فوراً حاضر ہوئی اور وزیر کو لاکھوں دعائیں دے کر بولی:

”سرکار، آج تو میری قسمت ہی جاگ گئی۔ حضُور نے مجھ غریب بڑھیا کو کیونکر یاد فرمایا؟ واری جاؤں، حضُور کا چہرہ اُترا ہوا ہے۔ کیا کوئی پریشانی آپ کے دُشمنوں پر

آن پڑی ہے؟“

”ہاں امّاں جان، کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ وزیر نے کہا۔ ”بادشاہ کا ایک مُصاحِب خواجہ بشیر میری جان کا دُشمن ہوا ہے۔ اُسے نیچا دکھانے کے لیے فکر مند ہوں۔ میں نے بادشاہ سے کہا کہ یہ شخص بہت گھٹیا درجے کا ہے اور آپ کا مُصاحِب بننے

کے اہل نہیں، مگر بادشاہ نے میری ایک نہ سُنی، اور کہنے لگا، اگر تم نے اپنے الزامات کا ثبوت پیش نہ کیا تو تمہیں عبرت ناک سزا دوں گا۔ اب اماں جان، میری عزّت و آبرو اور جان و مال سب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ کوئی ایسی تدبیر کرو جس سے خواجہ بشیر بادشاہ کی نظروں میں ذلیل ہو جائے۔ پھر میں تمہیں مُنہ مانگا انعام دوں گا۔"

"اے حضُور، میری جان آپ کے قدموں پر نثار۔" بڑھیا نے وزیر سے کہا۔ "کوئی ایک تدبیر، کہیے تو ہزار تدبیروں سے خواجہ بشیر کو بدنام کروں۔ اب آپ اِطمینان سے اپنے محل میں آرام فرمایئے اور باقی کام مجھ پر چھوڑ دیجیے۔"

چالاک بڑھیا نے اگلے دن پھٹے پُرانے چیتھڑے بدن پر لٹکائے اور لاٹھی ٹیکتی، جھُریوں بھری گردن ہلاتی، آہستہ آہستہ خواجہ بشیر کے مکان پر پہنچی۔ مکان کے اندر گھُسنے کا ارادہ کیا تو دربان نے ڈانٹ کر روکا:

”او بڑھیا! کون ہے تو اور کِدھر جاتی ہے ؟“

بڑھیا نے دربان کی طرف نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور چیخ کر بولی۔ ”ارے موئے تیرا ستیاناس ہو۔ تجھے باؤلا کتّا کاٹے۔ دیکھتا نہیں ہم خواجہ بشیر کی بیگم سے ملاقات کے لیے جارہے ہیں۔ تو ہمیں روکنے والا کون ہے ؟“

یہ کہہ کر بڑھیا نے دربان کو دھکا دے کر اندر جانے کی کوشش کی، مگر دربان نے جھلّا کر بڑھیا کی لاٹھی پکڑلی اور کہنے لگا:

”بڑی بی، کیا کہوں۔ میری نانی امّاں کے برابر ہو، اس لیے لحاظ کر گیا ورنہ کوئی اور اِتنی گالیاں مجھے دیتا تو مارتے مارتے کچومر نکال دیا ہوتا۔ خواجہ بشیر اس وقت مکان میں موجود نہیں اور نہ ان کی بیگم اجنبی عورتوں سے مِلتی ملاتی ہیں۔ اس لئے ٹھنڈے ٹھنڈے اپنا راستہ ناپو، ورنہ مجھے سختی سے کام لینا پڑے گا، دیکھ لو، میں بہت بُرا آدمی ہوں۔“

اتنا سُننا تھا کہ بڑھیا نے وہ فیل مچائے کہ خدا کی پناہ! لاٹھی زمین پر پھینک دی اور خود ذبح کیے ہوئے مُرغے کی طرح تڑپنے لگی۔ ساتھ ساتھ بھیانک آواز میں چلّاتی جاتی تھی:

"ارے لوگو! غضب خُدا کا۔ یہ دو ٹکے کا غُلام مُجھ غریب بڑھیا کو مار رہا ہے۔ ارے بچاؤ مجھے اِس موذی سے! یہ مُجھے مار ڈالے گا۔ یاالٰہی اس پر عذاب ٹوٹے، ابھی کھڑے کھڑے دم نکل جائے اس ظالم کا۔ ہائے ہائے! میری تو ہڈیاں توڑ دیں اس نے۔ ارے! میرے چھوٹے چھوٹے معصوم بچّے میرے بعد کیا کریں گے۔"

بڑھیا کا شور سن کر بہت سے راہ گیر جمع ہو گئے اور سب نے بے چارے دربان پر لعن طعن کی کہ شرم نہیں آتی تمھیں اس غریب بڑھیا پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے۔ دربان ہکّا بکّا اپنی جگہ کھڑا بڑھیا کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ بڑھیا مکر کر رہی ہے۔ جھوٹ بول رہی ہے۔ میں

نے اسے مارنا تو کُجا انگلی نہیں لگائی، لیکن کسی نے بے چارے دربان کی نہ سُنی۔

آخر اس ہنگامے کی خبر خواجہ بشیر کی بیوی کو بھی ہوئی۔ اس نے جلدی سے دو تین کنیزوں کو دروازے پر بھیجا۔ اور حکم دیا کہ ابھی، اسی وقت، اس بڑھیا کو ہمارے پاس عزّت آبرو سے لاؤ اور دربان سے کہہ دو کہ اگر آیندہ اس نے کسی عورت پر ہاتھ اُٹھایا یا اُسے دھتکارا تو اپنے آپ کو نوکری سے برخاست سمجھے۔

کنیزوں نے آناً فاناً ٹنڈا ڈولی کر کے مکّار کُٹنی کو بیگم کی خدمت میں پہنچا دیا۔ اس نے بڑھیا کو آنسو بہاتے اور پھٹے پُرانے کپڑوں میں لپٹے ہوئے دیکھا تو بہت ترس آیا، کہنے لگی:

”بڑی بی، میں معافی چاہتی ہوں کہ دربان نے آپ سے گستاخی کی۔ فرمایئے، کیسے آنا ہوا؟“

”اے بیٹی، اللہ تجھے سلامت رکھے۔ تیرا سہاگ قائم رہے۔ مدّت سے خواجہ بشیر

کا نام سُنتے آرہے ہیں کہ بڑا سخی ہے۔ بیٹی، میں ایک مُصیبت زدہ عورت ہوں، چھوٹے چھوٹے بچّوں کا ساتھ ہے اور کمانے والا کوئی نہیں۔ فاقوں نے نڈھال کر دیا ہے۔ بھیک مانگنے کی عادت نہیں۔ سوچا تھا کہ آج خواجہ بشیر کے پاس جاؤں اور اس سے مدد کی درخواست کروں، لیکن کیا خبر تھی کہ رئیسوں نے ایسے ایسے کتے پال رکھے ہیں جو غریبوں کو کاٹ کھانے دوڑتے ہیں۔"

"بیٹی، اب تم سے کیا کہوں۔ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کبھی ہم بھی روپے پیسے والے تھے۔ میرا شوہر لاکھوں میں کھیلتا تھا۔ زندگی بڑے عیش و آرام میں گزرتی تھی۔ ناگہاں ایک دن میرا شوہر گھوڑا گاڑی کے نیچے آن کر کچلا گیا۔ اس کے بعد ساری جائداد اور مال و دولت غیروں نے دھوکے دے دے کر ہتھیا لی اور ہمیں کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیا۔ جب تک میرے تن بدن میں جان رہی، محنت مزدوری کی اور بال بچّوں کا پیٹ بھرا، مگر اب میں کئی برس سے بیمار ہوں۔ کام کاج کرنے کے قابل نہیں۔ فاقوں پر فاقے ہونے لگے، تب مجبور ہو کر گھر سے نکلی تھی۔"

اتنی داستان سن کر بڑھیا زار و قطار رونے لگی۔ خواجہ بشیر کی بیوی اتنی نیک اور خدا ترس عورت تھی کہ بڑھیا کی داستان سن کر وہ بھی آنسو بہانے لگی۔ بڑھیا نے کہانی گھڑی ہی ایسی تھی کہ جو بھی سُنتا روئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ آخر بیگم نے کہا:

”بڑی امّاں، صبر کرو، خدا جو کرتا ہے، بہتر ہی کرتا ہے۔ دنیا کی دولت تو آنی جانی چیز ہے۔ ممکن ہے خدا تمہیں پھر مال دار بنا دے۔ افسوس! اس وقت میرا شوہر گھر میں موجود نہیں ورنہ اس کی اجازت سے میں تمہیں اتنے پیسے اور کپڑے دیتی کہ تمام زندگی تمہیں کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ تم یہاں اِطمینان سے بیٹھو۔ میرا شوہر بادشاہ سے ملنے گیا ہے۔ شاید ابھی واپس آ جائے۔“

چالاک بڑھیا سارا دن اس مکان میں رہی، اِتّفاق سے خواجہ بشیر شام تک واپس نہ آیا۔ جب اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا تو بڑھیا نے کہا:

”اے بیٹی! تمہارا میاں تو ابھی تک شاہی محل سے واپس نہیں آیا۔ ادھر میرے بچّے بھوک پیاس سے بلک رہے ہوں گے۔ کوئی ایسا بھی تو نہیں کہ میری غیر حاضری میں ان بچّوں کے حلق میں پانی کی دو بوندیں ہی ٹپکا دے۔ اب مجھے اجازت دو، پھر کبھی آؤں گی۔“

یہ سن کر خواجہ بشیر کی بیوی نے ایک بہت قیمتی چادر جو بادشاہ نے خواجہ بشیر کو تحفے میں دی تھی بڑھیا کو دے دی اور کہا۔ ”بڑی امّاں، اس وقت تو یہ چادر لے جاؤ۔ اس کے کناروں پر قیمتی موتی ٹکے ہیں۔ اگر تم اسے بازار میں بیچ دو تو ہزار دو ہزار روپے آسانی سے مِل جائیں گے۔ تم کل صبح ضرور آنا۔ اس وقت میرا شوہر مکان پر ہو گا۔ پھر میں تمہیں بہت سا روپیہ دلواؤں گی۔“

بڑھیا نے وہ قیمتی چادر لپیٹی اور بیگم کو سینکڑوں دُعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئی۔ اپنی کام یابی پر وہ بے حد خوش تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ خواجہ بشیر کی یہ چادر لے جا کر وزیر کو دکھائے گی تو وہ خوشی سے اُچھل پڑے گا اور اپنے وعدے

کے مطابق وہ اس سے مُنہ مانگا انعام حاصل کر لے گی۔

بڑھیا سیدھی وزیر کے محل میں گئی اور چادر اس کے آگے پھینکتے ہوئے بولی، ”لیجیے حضُور، آپ کے اقبال سے کامیابی کی صورت پیدا ہو گئی۔ میں نے بڑی کوشش سے یہ چادر حاصل کی ہے بلکہ خود خواجہ بشیر کی بیوی نے یہ چادر مجھے دی ہے۔“

وزیر یہ سُنتے ہی خوشی سے ناچنے لگا اور اسی وقت چادر بغل میں دبا، بڑھیا کو دعا دے کر پرے ہٹاتا ہوا اپنے محل سے نکلا اور شاہی محل کی جانب روانہ ہوا۔

اس نے شاہی محل میں پہنچ کر بادشاہ کو اپنی آمد کی اطّلاع کرائی۔ بادشاہ نے یہ سمجھ کر کہ شاید وزیر کوئی ضروری بات کرنے آیا ہے، فوراً اسے بُلا لیا۔

”کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ بادشاہ نے پوچھا۔

وزیر نے چادر بادشاہ کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”جہاں پناہ! یہ وہی چادر ہے نا جو آپ نے خواجہ بشیر کو عطا کی تھی؟“

بادشاہ نے چادر کو غور سے دیکھا اور پھر بولا ”ہاں ہاں یہ وہی چادر ہے جو ہم نے خواجہ کو خوش ہو کر عطا کی تھی لیکن یہ تمہارے پاس کیسے آئی؟“

مکار وزیر بولا۔ ”خواجہ بشیر نے یہ چادر اپنی بیوی کو دے دی تھی۔ وہ اسے بازار میں اونے پونے داموں بیچ رہی تھی کہ اتفاق سے میری نظر پڑ گئی۔ میں شاہی تحفے کی توہین برداشت نہ کر سکا اور چادر لے کر حضُور کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔“

بادشاہ یہ سُن کر حیران رہ گیا۔ وزیر نے دیکھا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے تو اسی وقت بادشاہ کو سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ بادشاہ نے سوچا اگر وزیر کی بات سچ نکلی تو واقعی خواجہ بشیر بہت گھٹیا آدمی ہے۔ وہ اسے دیے ہوئے قیمتی تحفوں کے ساتھ

ایسا سلوک کرتا ہے۔ اس کی نظر میں ان کی کوئی قیمت نہیں۔

دوسری طرف اُسے یہ احساس بھی ہوا کہ خواجہ بشیر اتنا پنچ نہیں ہو سکتا۔ غرض اسی سوچ بچار میں بادشاہ کو نیند آگئی۔

صُبح اٹھتے ہی اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ خواجہ بشیر کو بُلوایا۔ اتی صُبح بادشاہ نے اسے کبھی طلب نہیں کیا تھا۔ بے چارے خواجہ نے سوچا ممکن ہے بادشاہ سلطنت کے کسی اہم معاملے کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتا ہو اور اس مقصد کے لیے زیادہ انتظار کرنا اس کے لیے مشکل ہو، وہ اس وقت جس حال میں تھا، بھاگم بھاگ بادشاہ کی خدمت میں پہنچا۔

"جہاں پناہ، غُلام خدمت میں حاضر ہے؟" خواجہ بشیر نے بادشاہ کو جھک کر سلام کرتے ہوئے کہا۔ بادشاہ نے وہی چادر جو وزیر لایا تھا، خواجہ کی طرف پھینکتے ہوئے کہا:

”ذرا غور سے پہچانو، یہ چادر کس کی ہے؟“

خواجہ بشیر نے پہلی نظر میں پہچان لیا کہ یہ قیمتی چادر وہی ہے جو بادشاہ نے اسے دی تھی۔ لیکن وہ حیران تھا کہ یہ بادشاہ کے پاس کیوں کر پہنچی!

بادشاہ غصّے سے چلّایا۔ ”ہم آج تک تمہیں نہایت شریف اور اچھا آدمی سمجھے رہے۔ ہم نے تم پر وہ بھروسا کیا جو کسی اور پر کبھی نہیں کیا۔ لیکن اب پتا چلا کہ تمہاری اصلیت کیا ہے۔ یہ چادر جو ہم نے تمہیں عطا کی، تمہاری بیوی نے وزیر کے ہاتھ بیچ دی۔“

بادشاہ کے منہ سے یہ الفاظ سُن کر خواجہ بشیر کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ کوئی اور ہوتا تو اب تک وہ اُسے موت کے گھاٹ اُتار بھی چکا ہوتا، لیکن وہ بادشاہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے بہت ضبط کر کے اپنے غصّے پر قابو پایا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ سب وزیر کی شرارت ہے اور اس نے بادشاہ کی نظروں سے اس کو گرانے کے

لیے پر حرکت کی ہے۔ خواجہ کو اپنی بیوی کے بارے میں بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی مکان سے باہر نہیں گئی۔ پھر وہ اِس بکواس پر کِس طرح یقین کر لیتا۔ اس نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں بادشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن بادشاہ کا پارہ چڑھ چکا تھا۔ اس نے خواجہ کی کسی بات پر کان نہ دھرا اور اُسی وقت جلّاد کو طلب کی کے حکم دیا:

"لے جاؤ اس کم اصل اور پیچ دی کو میرے سامنے سے اور فوراً قتل کر دو۔ اس شخص کی سزا یہی ہے۔ اس نے ہمارے دیے ہوئے تحفے سے حقارت کا سلوک کیا ہے۔"

تمام درباری یہ حکم سُن کر دم بخود رہ گئے۔ ان میں اکثر ایسے تھے جو خواجہ بشیر کو اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بڑا ایمان دار اور نیک آدمی ہے، اور اُنہیں وزیر کے بارے میں بھی پتا تھا کہ وہ خواجہ بشیر سے حسد کرتا ہے۔ مگر بادشاہ کے حضُور میں کسی کو لب تک ہلانے کی جرأت نہ تھی۔

جلاد نے خواجہ کا بازو پکڑا اور دربار سے باہر لے گیا۔ وہ بھی خواجہ بشیر کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس نے خواجہ کے کان میں کہا۔ ”گھبرائیے مت۔ میں آپ کو اتنی جلدی قتل نہیں کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ بادشاہ نے جلد بازی سے کام لے کر آپ کے قتل کا حکم دیا ہے۔ میں اپنے گھر لے جا کر آپ کو چھُپا دوں گا۔ پھر موقع دیکھ کر بادشاہ اسے آپ کی جان بخشی کی درخواست کی جائے گی۔“

اِدھر تو بادشاہ نے خواجہ کو موت کی سزا سُنائی اور اُدھر خواجہ کے ایک دوست نے یہ خبر اس کی بیوی کو پہنچائی اور سارا قصّہ بھی کہا کہ کس طرح وزیر نے اس پر شاہی چادر بیچنے کا لزام لگایا۔

خواجہ کی بیوی نے کہا۔ ”خدا گواہ ہے کہ وہ چادر میں نے ایک بے کس، بے اسرا اور غریب بڑھیا کو دی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ خُدا کی طرف سے میری اور میرے شوہر کی آزمائش ہوئی ہے۔ انشا اللہ ہم ہر طرح اس آزمائش میں پورے اُتریں گے۔“

خواجہ کا دوست بیگم کی اس ہمّت اور حوصلے پر آفرین کہتا ہوا رخصت ہوا۔ اس کے جانے کے بعد بیگم نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالا اور سیدھی بادشاہ کے دربار میں پہنچی۔ اس وقت وزیر بھی وہاں موجود تھا۔ بیگم نے جاتے ہی دہائی دی۔

”انصاف! انصاف! اے مہربان اور عادل بادشاہ، میں تم سے انصاف کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔“

”اے عورت، بتا، تُجھے کس نے تکلیف پہنچائی؟ ہم پورا پورا انصاف کریں گے۔“ بادشاہ نے کہا۔

”جہاں پناہ، آپ کے وزیر نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں پچھلے پندرہ برس سے آپ کے وزیر کی بیوی ہوں۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر سال مجھے خرچ کے لیے نو سو روپے دیا کرے گا، لیکن اس دھوکے باز اور جھوٹے شخص نے آج تک مجھے ایک دھیلا بھی نہیں دیا اور مجھ پر نِت نئے ظلم توڑتا رہتا ہے۔ مجبور ہو کر آج میں آپ

کی خدمت میں فریاد لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ پچھلی رات وزیر نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی بھی دی ہے۔"

بادشاہ نے وزیر سے کہا۔ "اس عورت نے جو الزام تم پر لگایا ہے، تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے؟"

وزیر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ "عالی جاہ، یہ عورت جھوٹی ہے۔ میں حضُور کے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس عورت کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا، اور نہ میں اسے جانتا ہوں کہ یہ کون ہے۔"

"حضُور، وزیر نے آپ کے سر کی قسم کھا کر کہا ہے کہ وہ مجھے نہیں جانتا اور آج سے پہلے اس نے میری شکل تک نہیں دیکھی۔" عورت نے چِلّا کر کہا: "اسے حکم دیجیے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے، وہ ایک کاغذ پر لکھ دے تا کہ بعد میں مُکرنے کی گنجائش نہ رہے۔"

یہ کہہ کر عورت نے اپنا نقاب اُلٹ دیا اور بولی ”اس مکّار وزیر سے کہیے کہ میری صُورت غور سے دیکھ لے، اور لکھ کر انکار کرے کہ میں اس کی بیوی نہیں ہوں اور یہ مجھے نہیں جانتا۔“

وزیر نے اسی وقت کاغذ پر یہ عبارت لکھ دی:

”یہ عورت جھوٹی ہے۔ یہ میری بیوی ہرگز نہیں ہے اور نہ میں نے آج سے پہلے اس کی صورت کبھی دیکھی۔ میں اسے ہرگز نہیں جانتا کہ یہ کون ہے۔“

جب یہ تحریر وزیر نے لکھ دی تو عورت نے بادشاہ سے کہا: ”جہاں پناہ، جیسا کہ وزیر نے اقرار کیا ہے کہ وہ مجھے نہیں جانتا اور نہ اس نے آج سے پہلے میری صورت کبھی دیکھی ہے۔ میں عرض کرتی ہوں کہ وزیر کی یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ بے شک میں اس بدبخت کی بیوی نہیں۔ میں نے آپ کے سامنے اس کی مکّاری کا پول کھولنے کے لیے یہ غلط بیانی کی ہے۔ حضُور سچ تو یہ ہے کہ میں

خواجہ بشیر کی بیوی ہوں۔ اس مکار وزیر سے پوچھیے کہ اس نے مجھ پر کیوں بہتان لگایا کہ میں نے شاہی چادر کا تحفہ اس کے ہاتھ بیچا تھا؟ جہان پناہ، حقیقت یہ ہے کہ وہ چادر میں نے ایک غریب اور بے آسرا بڑھیا کو دی تھی۔ اُس سے کسی طرح وزیر نے حاصل کر لی اور مجھے بدنام کرنے کا موقع تلاش کیا۔"

بادشاہ نے قہر بھری نگاہوں سے وزیر کو گھورا۔ وزیر کے بدن میں کاٹو تو لہو نہیں۔ اسی وقت روتا ہوا بادشاہ کے قدموں میں گرا اور اپنے قصور کی معافی طلب کی۔ لیکن بادشاہ نے ٹھوکر مار کر اس کو پرے ہٹا دیا اور حکم دیا کہ جلّاد کو بُلایا جائے۔ حبشی جلّاد حاضر ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر وزیر کے رہے سہے ہوش بھی اُڑ گئے۔ لپک کر خواجہ بشیر کی بیوی کے قدموں میں گرا اور کہنے لگا:

"اے محترم خاتون، خدا کے واسطے بادشاہ سے سفارش کر کہ میری جان بخشی ہو۔"

بیگم نے کہا۔ ”تو نے وہ حرکت کی ہے کہ اس کی سزا موت سے بھی بڑھ کر ہے۔ تو نے میرے پیارے شوہر کی ہلاکت کا سامان کیا، لیکن خدا نے اُسے بچا لیا اور تجھے ہلاکت کے اس گڑھے میں گرایا جو تو نے اپنی مکّاری سے میرے شوہر کے لیے کھودا تھا۔ اب یہ بتا کہ وہ شاہی چادر تیرے پاس کیوں کر پہنچی؟“

وزیر نے کُٹنی کا حال سنایا۔ اسی وقت پیادے دوڑتے ہوئے گئے اور اُس خبیث بڑھیا کی مُشکیں باندھ کے لیے آئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ بڑھیا کو زمین میں آدھا گاڑ کر اس پر خوں خوار شکاری کتّے چھوڑ دیے جائیں اور وزیر کو قتل کر کے اس کی لاش جنگل میں پھینک دی جائے تاکہ جنگل کے جانور اسے نوچ نوچ کر اپنا پیٹ بھر سکیں۔

اس کے بعد شاہی جلّاد نے خواجہ بشیر کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور عرض کی کہ ”حضور، میں جانتا تھا کہ خواجہ بے گناہ ہے اس لیے میں نے آپ کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔“

بادشاہ نے خوش ہو کر جلّاد کو موتیوں کی ایک قیمتی مالا انعام میں دی اور خواجہ بشیر کو گلے سے لگالیا۔ چند روز بعد بادشاہ نے وزیرِ سلطنت کا درجہ خواجہ بشیر کو دیا اور حاسد وزیر کی تمام جائداد بھی اُسے عطا کر دی۔

شاہی نجومی

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کسی شہر میں ایک غریب آدمی رہتا تھا۔ وہ سارا دن پھیری پر شہر میں چیزیں بیچتا اور شام کو تھکا ہارا گھر واپس پہنچتا، اس محنت کے باوجود اس کے گھر کی حالت سُدھری نہیں تھی۔ کبھی کھانے کے لیے کچھ نہ ہوتا، کبھی پہننے کے لیے۔ لیکن وہ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا۔ جو اس کی آمدنی تھی، اُسی پر قناعت کرتا۔ کسی کو دھوکا دینے یا بے ایمانی سے دولت کمانے کا اسے کبھی خیال نہ آیا۔

ایک روز پھیری والے کی بیوی شہر کے ایک زنانہ حمام میں نہانے کے لیے گئی۔ اس زمانے میں لوگ گھروں میں نہیں نہایا کرتے تھے، بلکہ شہر میں مختلف مقامات پر چھوٹے بڑے سینکڑوں زنانہ مردانہ حمام کھلے ہوئے تھے۔ ان حماموں میں روزانہ ہزار ہا لوگ جا کر نہایا کرتے۔ یہاں نہانے کا بڑا عمدہ انتظام

تھا۔ ٹھنڈا اور گرم پانی نہانے والوں کی حسبِ منشا ہر وقت تیار ملتا تھا۔ نہلانے کے لیے کئی کئی خدمت گار اور کنیزیں موجود رہتیں۔ ہاں تو، ہم بتا رہے تھے کہ ایک روز غریب پھیری والے کی بیوی بھی نہانے کے لیے حمام میں گئی۔ ابھی اس نے نہانا شروع بھی نہ کیا تھا کہ ایک شان دار گھوڑا گاڑی حمام کے دروازے پر رُکی اور اُس میں سے ایک دولت مند خاتون اُتر کر حمام کے اندر آئی۔ اس خاتون کا لباس بے حد قیمتی اور خوش نما تھا، ہاتھوں اور گردن میں سونے کے نفیس زیور تھے، انگلیوں میں ہیرے کی کئی کئی انگوٹھیاں تھیں۔

حمام کے ملازموں نے لپک کر اس عورت کا استقبال کیا اور اسے جھک جھک کر سلام کیا۔ آنے والی کوئی بڑی ہی مغرور عورت تھی۔ اس نے کسی کے سلام کا جواب نہ دیا، بلکہ زور سے بولی:

"اس وقت حمام میں کون نہا رہا ہے؟ اُسے فوراً باہر نکالو۔ جب ہم نہا چکیں تب عام عورتوں کو نہانے کی اجازت دی جائے۔"

حمام کی کنیزوں نے فوراً ان تمام عورتوں کو نکال باہر کیا جو اس وقت حمام کے اندر نہار ہی تھیں یا نہانے کے لیے اپنی باری کے انتظار میں تھیں۔ ان ہی عورتوں میں پھیری والے کی بیوی بھی تھی۔ اس نے کہا بھی کہ یہ حمام امیر غریب سبھی عورتوں کے لیے ہے۔ آخر ہم کوئی مفت نہانے تو نہیں آئے۔ اُجرت ادا کریں گے۔ لیکن کنیزوں نے ایک نہ سُنی اور پھیری والے کی بیوی کو دھکے دے کر نکال باہر کیا۔ وہ بے چاری کر ہی کیا سکتی تھی۔ خُون کے سے گھونٹ پی کر چُپ ہو گئی۔

حمام سے باہر آ کر اس نے ایک عورت سے پوچھا۔ ''یہ عورت جو ابھی گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر آئی ہے، کون ہے؟''

''ارے تمھیں خبر نہیں؟'' دوسری عورت نے حیرت سے کہا۔ ''یہ شاہی نجومی کی بیوی ہے۔ اس کے میاں کا، شاہی دربار میں بڑا اثر ہے۔''

پھیری والے کی بیوی اپنی غربت کو روتی اور ٹھنڈی آہیں بھرتی واپس گھر چلی آئی اور اَٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہی۔ خود کچھ نہ کھایا، نہ بچوں کو کھانے دیا۔ شام کو پھیری والے آیا تو گھر والی کی یہ حالت دیکھی کہ مُنہ پھُلائے ایک طرف پڑی ہے اور بچے بھوک سے بِلک رہے ہیں۔ پھیری والے نے کہا:

"اری او بھاگوان! خیر تو ہے؟ یہ کیا تماشا ہے؟ بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں، کیا آج ہانڈی روٹی نہیں کی؟"

"اجی لعنت ہے ہانڈی روٹی کرنے والی پر۔" بیوی نے تڑاخ سے جواب دیا۔ "جس دن سے تمہارے پلّے بندھی ہوں ایک گھڑی سُکھ کی دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ کہاں قسمت پھوٹی کہ تم جیسے مفلس کے گھر میں آئی۔ دو کوڑی کی عزّت آبرو نہیں۔ اور اُدھر شاہی نجومی کی بیوی کے ٹھاٹ باٹ دیکھو۔ اللہ کی شان ہے۔ اس نے آتے ہی حمام میں سے ایک ایک عورت کو کان پکڑ کر نکلوا دیا۔ ارے میں کہتی ہوں آخر تم کیوں نہیں شاہی نجومی بن جاتے تا کہ میری بھی ویسی

ہی عزّت ہو اور میں جب چاہے دوسری بیبیوں کو حمام سے نکلوا سکوں۔"

یہ سن کر غریب پھیری والے کا ماتھا ٹھنکا۔ کرید کرید کر بیوی سے سارا قصّہ اُگلوایا۔ اُدھر بیوی کی یہ ضد کہ اگر تم شاہی نجومی بن کر نہ دکھاؤ گے تو میں اس گھر میں رہنے کی روادار نہیں۔ اب تو پھیری والے کے ہوش اُڑے، نرمی سے بولا:

"اری بے وقوف، نجومی بننا کوئی آسان کام ہے، اور وہ بھی شاہی نجومی، اری پگلی، اس کے لیے بڑا اِپتّا مارنا پڑتا ہے۔ دن رات نہ جانے کیا اَلّم غَلّم کتابیں اور نقشے دیکھنے پڑتے ہیں۔ پھر مہینوں برسوں اُستاد کی چلمیں بھرو۔ اس کے بعد کہیں علمِ نجوم میں کچھ شُد بُد ہوتی ہے۔ کوئی مذاق تھوڑا ہی ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔" بیوی نے جھنجھلا کر کہا۔ "خواہ کتابیں پڑھو نہ پڑھو، استاد کی شاگردی کرو یا نہ کرو، بس جلدی سے شاہی نجومی بن کر دکھاؤ، ورنہ میں چلی اپنے گھر۔"

پھیری والے نے سوچا کہ چند دن میں یہ بھُوت خود ہی اُس کے سر سے اُتر جائے گا۔ لیکن توبہ کیجیے، یہ بھُوت اُس عورت کے سر پر ایسا چڑھا کہ کِسی طرح اُترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے بس یہی رٹ تھی کہ شاہی نجومی بن جاؤ ورنہ میں اپنے گھر خُوش، تم اپنے گھر خُوش۔

آخر تنگ آ کر پھیری والے نے ایک پھٹا پُرانا بوریا اُٹھایا، چند نقشے سنبھالے جن پر تاروں کی اُلٹی سیدھی تصویریں بنی تھیں، ایک دو کتابیں علمِ نجوم کی کِسی کباڑیے سے خریدیں، ایک قلم، ایک دوات اور چند لوہے کے پانسے خریدے۔ پھر یہ سب چیزیں بورے پر سجا کر بازار میں جا بیٹھا۔ سامنے ایک تختی یہ عبارت لکھوا کر لگا دی:

"خاندانی نجومی۔ آپ کی قسمت کا تمام حال فوراً بتانے والا۔ آزمائش کر کے دیکھیے۔"

اتفاق کی بات، اس بے چارے نے اپنا ٹھیا ٹھکانا اُس جگہ بنایا تھا جہاں عورتوں کا وہ حمام تھا جہاں سے اُس کی بیوی کو بے عزّت کر کے نکالا گیا تھا، اسی روز بادشاہ کی بڑی بیٹی نہانے کے لیے حمام میں آئی۔ نہاتے وقت اس نے انگلی سے ہیرے کی انگوٹھی اُتار کر اپنی ایک خادمہ کو دی تاکہ حفاظت سے رہے۔ خادمہ کے حمام کی دیوار کے ایک ننھے سے سوراخ میں یہ انگوٹھی رکھ دی اور نشان کے طور پر اپنے سر کے بالوں کا ایک گچھا بھی اُس سوراخ میں پھنسا دیا۔ اس کے بعد وہ شہزادی کو نہلانے کے کام میں لگ گئی۔

اس زمانے میں امیر زادیوں اور شہزادیوں کا نہانا بھی ایسا ہی ہوتا تھا کہ صُبح سے شام تک حمام میں رہتی تھی۔ اس شہزادی نے بھی نہانے میں کئی گھنٹے لگا دیے اور جب جی بھر گیا تو اپنی کنیزوں اور لونڈیوں کو حکم دیا کہ ہمارے کپڑے اور زیور حاضر کرو۔ تمام کنیزوں نے شہزادی کا شاہی لباس اور سب زیور فوراً حاضر کیا۔ آخر میں شہزادی کو انگوٹھی یاد آئی۔ اس نے جس کنیز کو انگوٹھی دی تھی، اس سے کہا:

”ہماری انگوٹھی کہاں ہے، وہ ابھی تک کیوں پیش نہیں کی گئی؟ جلد انگوٹھی لائی جائے۔“

خدا کی قدرت کہ اس کنیز کو یاد ہی نہ رہا کہ اس نے شہزادی کی انگوٹھی کہاں رکھی تھی۔ بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر تلاش کرنی شروع کی۔ سارا حمام چھان مارا۔ ایک ایک چیز کی تلاشی لی۔ لیکن انگوٹھی نہ ملی۔ اب تو شہزادی کے غصّے کی حد نہ رہی۔ اس نے کنیز سے کہا۔ ”اگر سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے انگوٹھی ہمارے حضور میں پیش نہ کی گئی تو تمہیں قید خانے میں ڈال دیا جائے گا۔ یہ حکم سُن کر بے چاری کنیز کے اوسان خطا ہو گئے۔ روتی ہوئی حمام سے باہر بھاگی۔ اچانک اس کی نظر سامنے ہی بیٹھے ہوئے خاندانی نجومی پر پڑی، غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔ کنیز کو کچھ اور نہ سوجھا تو وہ سیدھی نجومی کے پاس گئی اور روتے ہوئے کہنے لگی:

”اے نجومی، خُدا کے واسطے میری مدد کرو۔ جلدی سے حساب کتاب لگا کر بتاؤ کہ میں نے شہزادی کی انگوٹھی حمام میں کس جگہ رکھی تھی، اگر سورج ڈوبنے سے

پہلے پہلے انگوٹھی کا پتا نہ لگا تو مجھے قید خانے میں ڈال دیا جائے گا۔"

بے چارے نجومی کو آتا جاتا تو کچھ تھا نہیں، یوں ہی جھوٹ مُوٹ قلم دوات اُٹھا کر کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں

کھینچنے اور اوٹ پٹانگ ہندسے لکھنے لگا۔ پھر یُوں آسمان کی جانب نگاہ اٹھا کر گھورتا رہا جیسے ستاروں سے مشورہ کر رہا ہو، پھر بڑبڑاتے ہوئے بولا:

"اگر آسمان میں کوئی سوراخ ہوتا تو میرے بال بچّے بھوکے نہ مر جاتے۔ اگر آسمان میں کوئی سوراخ ہوتا تو میرے بال۔۔۔" سوراخ اور بال کے الفاظ سُنتے ہی کنیز کا دماغ ایک دوم روشن ہو گیا۔ اسے یاد آگیا کہ شہزادی کی انگوٹھی کہاں رکھی ہے۔

وہ بے تحاشا دوڑتی ہوئی حمام میں گئی، دیوار کے سوراخ میں سے اپنے بالوں کا گچھا ہٹا کر انگوٹھی نکالی اور شہزادی کی خدمت میں پیش کر دی۔ شہزادی نے پوچھا:

”انگوٹھی کہاں سے ملی؟“

کنیز نے بتایا۔ ”حمام کے باہر ایک بڑا باکمال نجومی بیٹھا ہے۔ اس نے علمِ نجوم کے ذریعے بتایا کہ انگوٹھی میں نے کہاں رکھی تھی۔“

شہزادی یہ بات سن کر بہت حیران ہوئی اور محل میں جا کر بادشاہ سے اس کا ذکر کیا، بادشاہ اسم قسم کے نجومیوں کی ہمیشہ تلاش میں رہتا تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ ابھی اس نجومی کو ہمارے سامنے حاضر کیا جائے۔

حکم کی دیر تھی کہ شاہی چوب داروں اور سپاہیوں نے نجومی کو بادشاہ کی خدمت میں حاحاضر کر دیا۔ بادشاہ نے کہا:

”اے نجومی، ہم نے شہزادی کی زبانی تیرے کمال کا حال سُنا۔ ایسے فنکاروں کی ہمارے ہاں بڑی قدر ہوتی ہے، آج سے ہم نے تمہیں درباری نجومی کا عہدہ بخشا۔ پانچ سو روپے تنخواہ ہو گئی۔ ایک گھوڑا اور خلعتِ شاہی بھی عطا کیا جائے گا۔

اب تم جاسکتے ہو۔ جب کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوگا تب تمہیں یاد کیا جائے گا۔"

نجومی بادشاہ کو سلام کر کے رُخصت ہوا اور سیدھا اپنے گھر پہنچا۔ وہ اس خیال سے اندر ہی اندر ڈر رہا تھا کہ اگر آزمائش کا وقت آیا تو کیا کرے گا۔ اُسے تو نجوم کی الف بے کا پتا بھی نہ تھا۔

اس نے اپنی بیوی کو یہ خبر سُنائی کہ بادشاہ سلامت نے اُسے آج سے درباری نجومی کا عہدہ عطا کیا ہے، پانچ سو روپے تنخواہ مقرر کی ہے، اس کے علاوہ ایک گھوڑا اور درباری لباس بھی عنایت ہوا ہے تو بیوی خوشی سے اُچھل پڑی۔

"دیکھا، میں نہ کہتی تھی کہ نجومی بن جاؤ۔ اب کیسی عزّت ہوگی سارے شہر میں تمہاری۔ ہر شخص تمہارے رعب میں رہے گا اور لوگ تمہیں جھک جھک کر سلام کیا کریں گے۔ اب میں بھی شاہی نجومی کی بیوی کی طرح شان دار گاڑی میں سوار ہو کر حمام جایا کروں گی اور وہاں جتنی گھٹیا درجے کی عورتیں ہوں گی، ان

سب کو نکلوا کر پہلے خُود نہاؤں گی۔ آہا! کتنا مزا آئے گا، جب حمّام کی سب کنیزیں میری خوشامد کریں گی اور انعام لینے کے لیے میرے آگے پیچھے پھرا کریں گی۔"

بیوی تو ان خوابوں میں کھوئی ہوئی تھی اور اُدھر میاں نجومی کے باتوں کے طوطے اُڑے ہوئے تھے، جانتا تھا کہ اگر بادشاہ کی آزمائش میں پورا نہ اُترا تو پھر جلّاد کی تلوار ہو گی اور اس کا سر۔ بادشاہ تو سزائے موت ہی دے گا۔ اسی فکر میں روز بروز بے چارے نجومی کی جان گھلنے لگی۔

ابھی اُسے درباری نجومی بنے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ آزمائش کی وہ نازک گھڑی سر پر آن پہنچی۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مُنہ اندھیرے ہی نجومی کو محل میں بلایا اور کہا:

"ارے نجومی غضب ہو گیا! کل چند ڈاکوؤں نے شاہی خزانہ لوٹ لیا۔ اب جلدی سے نجوم کے ذریعے ان ڈاکوؤں کا سراغ لگاؤ تا کہ ہم انہیں گرفتار کر کے شاہی

خزانہ بر آمد کریں۔"

یہ سنتے ہی نجومی کا خُون خُشک ہو گیا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں اور چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا۔ نجومی خاموش کھڑا رہا۔ بادشاہ نے کڑک کر کہا:

"اس کام کے لیے جتنے دن کی مہلت چاہو طلب کر لو۔ اس مُدّت کے اندر اندر تمھیں ڈاکوؤں کا پتا نشان معلوم کرنا ہے۔ اگر تم اس کام میں پورے اترے تو ہم تمھیں مالا مال کر دیں گے، اور اگر ناکام رہے تو تمھیں سولی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اب تم بتاؤ کہ کتنی مُدّت درکار ہے؟"

"حضُور، مجھے چالیس دِن کی مہلت عطا کی جائے۔" نجومی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کی ذات سے اُمّید ہے کہ میں اس مُدّت میں ڈاکوؤں کا سراغ لگا لوں گا۔"

"تمھیں چالیس دن کی مہلت دی جاتی ہے۔" بادشاہ نے کہا۔ "اب تم جا سکتے

ہو۔"

نجومی گرتا پڑیا گھر واپس آیا۔ اس وقت اسے اپنی بے وقوف بیوی پر بڑا تاؤ آرہا تھا جس نے اُسے اچھّا خاصا پھیری کا کام چھوڑ کر شاہی نجومی بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس کا بس چلتا تو بیوی کو کچّا ہی چبا جاتا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت۔ ان کم بخت ڈاکوؤں کا پتا گانا نجومی کے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا چالیس دن بعد موت کی سزا ملنا تھی۔

"اب میں ان ڈاکوؤں کو کہاں تلاش کروں؟" نجومی نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں تو کیا میرا باپ زندہ ہوتا تو وہ بھی انہیں ڈھونڈ نہیں سکتا تھا۔ کیا خبر تھی میری موت اسی طرح لکھی ہے۔"

زندگی سے سخت مایوس ہو کر نجومی نے مِٹّی کا ایک مرتبان لیا اور اس میں کھجوروں کی چالیس گٹھلیاں ڈال کر بیوی سے بولا:

"اری او نیک بخت، اب ہر شام اِس مرتبان میں سے ایک گٹھلی نکال کر مجھے دیتی رہنا۔ جب چالیس دن پورے ہو جائیں گے تو اس منحوس شہر سے کہیں اور بھاگنے کی کوشش کریں گے تاکہ جان بچ جائے۔"

یہ سُن کر بیوی گھبرائی اور پوچھنے لگی کہ "قصّہ کیا ہے؟" تب نجومی نے سب احوال کہہ سُنایا۔ اب تو بیوی کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ لیکن بے چاری رونے دھونے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی تھی۔

اب ایک عجیب اِتّفاق یہ ہوا کہ جن ڈاکوؤں نے شاہی خزانے پر ہاتھ صاف کیا تھا، اُن کی تعداد بھی چالیس تھی اور انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ بادشاہ نے اپنے ایک نجومی کو حکم دیا ہے کہ چالیس دن کے اندر اندر ڈاکوؤں کا پتا نشان معلوم کرے۔ یہ حُکم سُن کر ڈاکو بہت پریشان تھے اور سوچ رہے تھے کہ سُنا ہے یہ نجومی بڑا قابل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے عِلم کی مدد سے ہمارا سُراغ لگا کر بادشاہ کو بتا دے۔

چنانچہ پہلی رات ہی ان چالیس ڈاکوؤں میں سے ایک ڈاکو چُپکے سے نجومی کے مکان کی چھت پر چڑھ گیا تاکہ معلوم ہو کہ نجومی کیا کر رہا ہے۔ ابھی ڈاکو کو چھت پر چڑھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ نجومی کی بیوی کی آواز اس کے کان میں آئی۔ وہ اپنے میاں سے کہہ رہی تھی:

"یہ لو، اُن چالیس میں سے ایک۔"

اُس نے چالیس گٹھلیوں میں سے پہلی گٹھلی اپنے میاں کو دیتے ہوئے یہ جُملہ کہا تھا۔ لیکن اُدھر ڈاکو کے اوسان خطا ہوئے۔ وہ جلدی جلدی چھت سے اُتر کر اپنے سردار کے پاس گیا اور بُری طرح ہانپتے ہوئے بولا:

"مارے گئے! جب میں نجومی کے مکان کی چھت پر چھُپا ہوا تھا تو بیوی نے اپنے میاں کو بتا دیا کہ لو، یہ ہے چالیس میں سے ایک۔ نجومی تو نجومی، اس کی بیوی بھی یہ فن جانتی ہے، ورنہ اُسے میرے بارے میں کیسے پتا چلتا؟"

یہ سن کر ڈاکوؤں کا سردار اور بھی فکر مند ہوا۔ اگلے روز شام کے وقت سردار نے اپنے دو آدمی نجومی کے مکان پر بھیجے اور انہیں ہدایت کی کہ جو کچھ نجومی اور اُس کی بیوی آپس میں باتیں کریں، وہ آن کر ٹھیک بتائیں۔

دونوں ڈاکو مکان کی چھت پر چڑھے اور دُبک کر ایک کونے میں بیٹھے رہے۔ اتنے میں عورت کی آواز ان کے کان میں آئی۔ وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی:

"یہ لو، چالیس میں سے دو۔"

یہ سنتے ہی دونوں ڈاکو سر پر پیر رکھ کر بھاگے اور سردار کو بتایا کہ نجومی کی بیوی کو ہم دونوں کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً اپنے ماں کو بتا دیا۔

غرض روزانہ ایسا ہی ہونے لگا۔ آخر کار چالیسویں شام آئی۔ اس روز ڈاکوؤں کے سردار نے فیصلہ کیا کہ وہ خود نجومی کے مکان پر جائے گا اور اپنے کانوں سے میاں بیوی کی باتیں سُنے گا۔ وہ نجومی کے مکان کی چھت پر چڑھا اور دبک کر بیٹھ گیا۔

اُس روز مرتبان میں آخری گٹھلی باقی رہ گئی تھی، اور اِتّفاق سے یہ سب گٹھلیوں سے بڑی اور موٹی تھی۔

تھوڑی دیر بعد سردار نے سُنا، نجومی کی بیوی کہہ رہی تھی۔ "یہ لو، اب آخری ہے اور اس کے بعد کام ختم۔ بس یہی سب سے وزنی سمجھو۔"

یہ سنتے ہی ڈاکوؤں کے سردار نے دھم سے مکان میں چھلانگ لگائی اور جاتے ہی نجومی کے پاؤں پکڑ لیے۔ دونوں میاں بیوی خوف زدہ ہو گئے کہ یہ آدمی ایک دم کہاں سے آن کُودا! ابھی نجومی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ ڈاکوؤں کا سردار گڑگڑا کر بولا:

"جناب، میں نے ہی اپنے ساتھیوں سمیت شاہی خزانہ لوٹا تھا لیکن آپ نے علمِ نجوم کے ذریعے آخر کار ہمارا سراغ لگا ہی لیا۔ میں سارا خزانہ واپس کرتا ہوں، لیکن آپ بادشاہ سلامت کو ہمارا پتا نشان نہ بتائیں۔ ہم نے وہ سارا خزانہ جنگل میں

بڑ کے سب سے بڑے درخت کے نیچے دفن کر رکھا ہے۔ بادشاہ کو اِطّلاع دے دیجیے اور خُدا کے واسطے ہماری جان بخشی کرائیے۔"

اور یوں شاہی خزانہ برآمد ہو گیا۔ بادشاہ بے حد خوش ہوا اور نجومی کو بہت انعام دیا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ آیندہ سے دربار میں ایک کُرسی نجومی کے لیے بھی رکھی جایا کرے۔ لیکن نجومی اپنی اس عزّت افزائی پر خوش نہ تھا۔ بھلا وہ خوش کیسے ہوتا۔ جانتا تھا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ کبھی نہ کبھی تو چھُری تلے آئے گی۔

ایک روز بادشاہ اپنے لاؤ لشکر سمیت جنگل میں شکار کھیلنے گیا۔ نجومی بھی ساتھ تھا۔ اس کا قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے بادشاہ نے اُسے ٹِڈّے میاں کا خطاب دے رکھا تھا، شکار کھیلتے کھیلتے بادشاہ کو شرارت سوجھی۔ چُپکے سے ایک ٹِڈّا پکڑ کر مُٹھّی میں بند کیا اور نجومی کو اپنے پاس بُلا کر پوچھا:

”بتاؤ، ہماری مُٹھّی میں کیا ہے؟ نہ بتا سکے تو تمہارا زن بچّہ کولہو میں پِلوا دیا جائے گا۔“

نجومی لرز گیا، ایک نظر بادشاہ پر ڈالی، پھر اپنی زندگی سے مایوس ہو کر بولا:

”لو ٹِڈّے میاں، اب تمہاری جان بادشاہ کی مُٹھّی میں ہے۔ اس مرتبہ بچ کر کہاں جاؤ گے۔“

یہ سُنتے ہی بادشاہ نے قہقہہ لگایا اور مُٹھّی کھول دی۔ ٹِڈّا اُڑ گیا۔ نجومی اس عجب اتّفاق پر حیران ہوا اور دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ جان بچ گئی۔

گھر واپس پہنچ کر نجومی نے سوچا کہ آخر کب تک میں اپنے آپ کو بچاتا رہوں گا۔ کوئی دن ایسا ضرور آئے گا جب میں بادشاہ کے سوالوں کے جواب نہ دے پاؤں گا اور پھر مجھے سخت سزا ملے گی۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس پیشے ہی سے توبہ کر لوں۔ لیکن بادشاہ کی نوکری چھوڑنا کوئی خالہ جی کا گھر نہ تھا کہ ایک دم جا کر استعفا

دے دیا اور کہہ دیتا کہ حضُور، میں اب نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ ایسی گُستاخی بادشاہ برداشت نہیں کیا کرتے، پھر کیا کیا جائے؟ یہ سوال اُسے پریشان کر رہا تھا۔ کوئی تدبیر اس کے ذہن میں نہ آتی تھی۔

ایک دن وہ نہانے کے لیے غسل خانے میں گیا تو یکایک ایک نرالی تدبیر اس کے دماغ میں آئی۔ کیوں نہ میں پاگل بن جاؤں؟ اس طرح بادشاہ خود بخود مجھے نوکری سے جواب دے دے گا۔ یہ تدبیر ایسی تھی کہ نجومی خوشی کے مارے واقعی پاگل ہو گیا۔ غسل خانے سے ننگا ہی نکل کر بازاروں اور گلیوں میں سے بھاگتا ہوا سیدھا شاہی محل میں جا گھُسا۔ بادشاہ اپنے کمرے میں آرام کر تھا۔ پہرے دار نجومی کو روکتے ہی رہے لیکن وہ دھڑاک سے بادشاہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گیا اور سوئے ہوئے بادشاہ کو گود میں اُٹھا کر کمرے سے باہر نِکل گیا۔

ابھی بادشاہ نجومی کی اس بد تمیزی اور گستاخی کے بارے میں کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا

کہ دھڑام سے کمرے کی چھت گر گئی۔ اگر بادشاہ کو وہاں سے نکلنے میں تھوڑی سی دیر اور ہوتی تو چھت اس پر آن گرتی۔

بادشاہ نے یہ ماجرا دیکھ کر نجومی کو گلے سے لگا لیا اور خُوش ہو کر بولا۔ ''میرے وفادار دوست، آج تم نے ہماری جان بچالی۔ تم نے شاید علمِ نجوم کے ذریعے معلوم کیا تھا کہ ہمارے کمرے کی چھت گرنے ہی والی ہے۔ اس لیے تم غسل خانے سے نکل کر ننگے ہی دوڑے چلے آئے۔ ہم تمہاری وفاداری اور جاں نثاری پر بہت خوش ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ آج سے تمہارا درجہ بڑھا کر تمہیں شاہی نجومی بنادیا جائے۔

نجومی نے ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گیا۔

اگلے ہی روز اس کی بیوی ایک شان دار گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر حمام میں نہانے کے لیے گئی۔ حمّام کی کنیزیں اور خادمائیں اس کے استقبال کے لیے دوڑیں، کیوں

کہ اب وہ شاہی نجومی کی بیوی تھی۔ وہ یہ جان کر دل میں بڑی خوش ہوئی کہ سابق شاہی نجومی کی بیوی اس وقت حمّام میں نہا رہی ہے۔

"حمّام فوراً خالی کرایا جائے۔" نئے شاہی نجومی کی بیوی نے رُعب دار آواز میں حکم دیا۔ "پہلے میں نہاؤں گی، اس کے بعد کسی اور کو نہانے کی اجازت ہوت گی۔"

حکم کی دیر تھی کہ کنیزوں نے حمّام میں نہانے والی کئی عورتوں کو نکال باہر کیا۔ ان ہی میں سابق شاہی نجومی کی بیوی بھی شامل تھی۔ وہ گردن جھکائے ایک طرف چلی گئی۔ سچ ہے، غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے اور خدا جسے چاہتا ہے عزّت دیتا ہے۔

اندھا فقیر

بہت مدّت ہوئی، ملک ایران کے مشہور شہر تبریز میں یک غریب اندھا فقیر رہتا تھا، وہ مُنہ اندھیرے اُٹھتا، بائیں ہاتھ میں لکڑی کا ایک بڑا سا پیالہ لیتا اور دائیں ہاتھ میں لاٹھی سنبھال کر بازاروں میں بھیک مانگنے نکل کھڑا ہوتا۔ سارا دن گلی گلی کوچے کوچے بھیک مانگتا اور جب سُورج مغرب کی برف جھُکنے لگتا تو شہر سے باہر اپنی ٹوٹی پھُوٹی جھونپڑی میں رات بسر کرنے آجاتا۔

اندھے فقیر کی آواز میں بڑا درد تھا۔ بھیک مانگتے ہوئے وہ طرح طرح کے نصیحت آمیز جُملے اُونچی آواز میں کہتا جاتا۔ یہ جُملے اُن لوگوں کے دلوں پر بہت اثر کرتے جن کے دروازوں پر اندھا فقیر روزانہ بھیک مانگنے جایا کرتا تھا۔ کبھی وہ کہتا۔

”اے لوگو! غُرور نہ کیا کرو۔ غُرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔ جس نے غُرور کیا، وہ دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوا، اور آخرت میں بھی ذلیل وخوار ہوگا۔“

”اے لوگو! انصاف اور دیانت داری سے کام لو۔ یاد رکھو جو دوسروں کو دھوکا دیتا ہے، خدا اس سے ایک روز سب کچھ چھین لیتا ہے۔“

”اے لوگو! مجھے دیکھو۔ کبھی میں بھی تمہاری طرح آنکھوں والا تھا۔ کبھی اس شہر میں میری بھی بڑی عزّت تھی۔ لیکن آج اپنے گناہوں کی سزا پا رہا ہوں۔ خدا کے لیے کبھی کسی کو دھوکا نہ دو۔“

اسی قسم کی آوازیں لگاتا ہوا ایک روز وہ شہر کے گلی کوچوں میں گھوم رہا تھا کہ ایک امیر آدمی نے اس سے کہا:

”بابا، میں بہت عرصے سے تمہیں دیکھ رہا ہوں اور جو آوازیں لگاتے ہو، وہ بھی سُنتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے تم نے بڑی مُصیبتیں جھیلی ہیں۔ آؤ، آج میرے پاس بیٹھو

اور اپنی رام کہانی سُناؤ۔ فکر مت کرو۔ جس قدر بھیک تمہیں دن بھر گھوم پھرنے کے بعد شہر سے ملتی ہے، وہ میں تمہیں دوں گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ اپنی دکھ بھری داستان سچ سچ سُناؤ۔"

اندھے فقیر نے اپنی لاٹھی اور بھیک مانگنے کا پیالہ وہیں زمین پر رکھ دیا اور اس نیک دل امیر آدمی کو دُعائیں دیتے ہوئے بالا:

"میاں، خدا تمہیں خوش رکھے۔ مجھ غریب کی آپ بیتی سُن کر کیا کرو گے۔ بس جو میں کہا کرتا ہوں، اس پر عمل کیے جاؤ۔ میں ایسا ذلیل اور سنگ دل شخص ہوں کہ میری داستان سُننے کے بعد تم مجھے دُھتکار کر اپنے گھر سے نکال دو گے۔"

امیر آدمی کے اندھے فقیر کو یقین دلایا کہ وہ ہر گز ہر گز یہ سلوک نہ کرے گا بلکہ وہ تو عبرت حاصل کرنے کے لیے اس سے کہانی سُننے کا خواہش مند ہے۔ اندھے فقیر نے ٹھنڈی آہ بھر کر یوں اپنی کہانی شروع کی:

”جناب، میں شہر تبریز ہی کا رہنے والا ہوں اور اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس نے بڑی شفقت اور محبت سے میری پرورش کی۔ میری ماں مجھے چھوٹا سا چھوڑ کر ہی مر گئی تھی، اور میری دیکھ بھال کرنے والا میرے باپ کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ میرا باپ نہایت غریب آدمی تھا۔ سارا دن گھوم پھر کر مختلف چیزیں بازاروں میں بیچتا۔“

”وہ اپنے کام میں بڑا محنتی اور دیانت دار تھا، اس لیے خدا نے اس کے کاروبار میں برکت دی۔ آہستہ آہستہ اُس کے پاس خاصی دولت جمع ہو گئی اور اس نے شہر کے ایک بارونق بازار میں دُکان خرید لی۔ کچھ عرصے بعد اس نے جواہرات کی خرید و فروخت کا کاروبار شروع کیا۔ شہر میں باپ کی بڑی ساکھ تھی۔ دوسرے تاجر اور جوہری اُسے زبانی وعدے پر ہزاروں لاکھوں کے جواہر دے دیا کرتے تھے اور سارے شہر میں، بلکہ تمام ملک میں میرے باپ کی ایمان داری اور شرافت کی دھوم تھی۔ ہر شخص اس کی عزّت کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرا باپ اپنی ان ہی خوبیوں کے باعث مُلک کا سب سے دولت مند جوہری بن گیا۔“

”مجھے اس نے برابر اپنے ساتھ کاروبار میں شامل رکھا اور تجارت کی اُونچ نیچ اچھی طرح سمجھائی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بیٹا، یہ سب مال و دولت اور کاروبار میرے بعد تمہارا ہے اور تم ہی اسے سنبھالو گے۔ لیکن یاد رکھو، دیانت، محنت، اچھی ساکھ کاروبار کی جان ہیں۔ جب تک تم ان باتوں پر عمل کرتے رہو گے، تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اور اگر خدانخواستہ تم نے تجارت میں بے ایمانی، فریب اور دھوکے کو دخل دیا، لوگوں سے جھوٹے وعدے کر کر کے مال خریدنا شروع کیا، انہیں رقم ادا نہ کی تو سمجھ لو کہ ایک دن نہ صرف یہ تمام دولت تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے گی، بلکہ تُم خدا اور اس کی مخلوق کے سامنے بھی ذلیل ہو گے۔ لہٰذا یہ طے کر لو کہ کیسے ہی حالات پیش کیوں نہ آئیں، ایمان داری اور دیانت کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔“

”میں اپنے باپ کی یہ قیمتی باتیں اور عُمدہ عُمدہ نصیحتیں دن رات سُنتا اور ان پر عمل کرنے کا وعدہ کرتا۔ کچھ عرصے بعد میرا باپ دوسرے تاجروں کے ساتھ موتی خریدنے کے ارادے سے بحرین کے سفر پر روانہ ہوا۔ اسے اس کاروبار میں بڑا

نفع ہوا۔ مگر چند دن کے اندر اندر وہ بیمار ہو کر مر گیا۔ باپ کے مرتے ہی دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ ایسا لگا کہ اس غم سے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھوں گا۔ کسی بات اور کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ ہر وقت باپ کی صُورت نگاہوں کے سامنے رہتی۔ ایک کونے میں مُنہ چھُپائے آنسو بہاتا رہتا۔“

”آہستہ آہستہ یہ حالت دُور ہونی شروع ہوئی۔ میں نے کاروبار کی طرف دھیان دیا۔ دوسرے تاجروں نے بھی میرا حوصلہ بڑھایا اور ہر قسم کے مشورے اور مدد کا وعدہ کیا۔ غرض میں دُکان پر بیٹھنے لگا اور وہ تمام لگے بندھے گاہک، جو میرے باپ کی زندگی میں جواہرات خریدنے کے لیے دُکان پر آتے تھے، اب بھی آنے لگے۔“

کچھ عرصے تک تو میں اپنے باپ کی وصیّت کے مطابق ایمان داری سے کاروبار چلاتا رہا مگر پھر ایسا ہوا کہ زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی دھن میرے سر پر سوار ہو گئی۔ میں چاہتا تھا کہ دُکان میں جتنی تجوریاں رکھی ہیں، ان سب میں

سونے کی اشرفیاں اور ہیرے جواہرات نیچے سے اُوپر تک بھرے ہوں، اور میں انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہوں۔"

"دولت کمانے کی یہ ہوس روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ یہاں تک کہ میں اپنے باپ کی تمام نصیحتیں بھول گیا اور کاروبار میں بے ایمانی سے کام لینے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ گاہکوں کو دھوکا اور فریب دے کر میں زیادہ دولت کما سکتا ہوں۔ کبھی کبھی میرا دل ملامت بھی کرتا کہ مجھے یہ حرکت نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن جُوں جُوں دولت کے خزانے میرے پاس جمع ہوتے گئے، دل نے لعنت ملامت کرنی بھی چھوٹ دی۔ اب میں دھڑلّے سے لوگوں کو لُوٹ لُوٹ کر اپنی تجوریاں بھرنے لگا۔"

"ایک روز میں اپنی دوکان کھول کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک شخص آیا۔ اس کا لباس بوسیدہ اور پھٹا ہوا تھا۔ چہرے پر رنج اور غم کے آثار تھے۔ اس نے آتے ہی مجھے سلام کیا اور دعائیں دینے لگا۔ میں سمجھا کوئی بھیک منگا ہے۔ صُبح صُبح بھیک منگے کو

دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے اسے دُھتکار کر بھگانا چاہا۔ لیکن اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "جناب، میں فقیر یا بھکاری نہیں ہوں۔ کبھی میرا شمار بھی اپنے شہر کے کھاتے پیتے لوگوں میں تھا، لیکن بدقسمتی سے حالات ایسے خراب ہوئے کہ فاقوں تک نوبت آ پہنچی۔ اب مجبور ہو کر میں اپنی بچی ہوئی دولت کا آخری حصّہ لے کر بازار میں آیا ہوں۔"

"یہ کہہ کر اس شخص نے اپنی گُدری میں سے ایک بہت قیمتی لعل نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ بچپن سے لے کر جوان ہونے تک میں نے ایک سے ایک قیمتی ہیرے اور جواہر دیکھے تھے لیکن اس جیسا لعل کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ ایسا عُمدہ نگینہ تو بادشاہوں کے خزانے ہی میں ہوا کرتا ہے۔"

میں اس لعل کو دیکھ کر دل میں خوش تو بہت ہوا، مگر مکّاری سے کام لے کر یوں ہی بے پروائی سے اسے دیکھا اور ماتھے پر بل ڈال کر کہا:"

”میاں، یہ کیا اٹھالائے ہو۔ اس میں کوئی خاص بات تو ہے نہیں۔ پھر بھی بولو، کیا دے دوں اس کا؟“

”اس شخص نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا:“

”جناب آپ اس شہر کے سب سے بڑے جوہری ہیں۔ یہی سوچ کر میں آپ کی دُکان پر آیا تھا کہ اس قیمتی پتھّر کی صحیح قیمت مجھے عطا کریں گے۔ یقین کیجیے کہ میرے پاس جتنے بھی قیمتی جواہر تھے یہی ان سب میں بے مثال ہے اور اب آپ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں۔“

”اُس شخص کی یہ بات سن کر میں نے ایک بار پھر اس لعل کو ہاتھ میں اُٹھایا اور خوب غور سے دیکھا بھالا۔ بے شک وہ بے حد قیمتی پتھر تھا۔ اس کی قیمت ایک ڈیڑھ لاکھ اشرفیوں سے کیا کم ہو گی لیکن میں نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا:“

"ارے صاحب، آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ یہ لعل اس قدر قیمتی نہیں۔ اس میں تو کئی عیب ہیں۔ شاید آپ نے ان عیبوں پر غور نہیں کیا۔ پہلا عیب تو یہ ہے کہ اس کا رنگ ایک سا نہیں۔ کہیں سے ہلکا ہے، کہیں سے گہرا۔ پھر وزن بھی کچھ زیادہ نہیں۔ اور سب سے بڑا سبب یہ کہ اس کے جگر میں ایک داغ ہے۔ اگر یہ عیب اس میں نہ ہوتے تو یہ لاکھوں کی مالیت کا ہوتا۔ اب تو اس کی قیمت چند دینار سے زیادہ نہیں۔"

"یہ کہہ کر میں نے لعل اس کے سامنے دھر دیا اور بے پروائی سے دوسرے کاموں میں یوں مصروف ہو گیا جیسے مجھے اس اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اگرچہ اندر سے میرے دل میں بڑی ہل چل مچ رہی تھی کہ یہ شخص لعل کو اٹھا کر کسی دوسرے جوہری کی دُکان پر نہ لے جائے، مگر معلوم ہوتا ہے وہ مجبوری کے ہاتھوں بہت پریشان تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:"

"اچھا جناب، جو آپ فرماتے ہیں، وہ درست ہو گا۔ مگر اس وقت تو یہ لعل مجھ

سے خرید ہی لیجیے۔ آپ کا بڑا احسان ہو گا مجھ پر۔"

"اس کی یہ بات سن کر میں سمجھ گیا کہ شکار پھنس چکا ہے اور یہ اپنا قیمتی لعل میرے ہاتھ اونے پونے بیچ ہی ڈالے گا۔ میں نے ہمدرد بن کر کہا:"

"ارے میاں، اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ جو خدمت مجھ سے ہو سکتی ہے وہ کرنے کے لیے تیّار ہوں۔ فرمایئے۔ اس کے کتنے پیسے دے دوں؟"

"اجی جناب، اب میں اپنے مُنہ سے کیا عرض کروں جو قیمت آپ مناسب خیال کریں، دے دیں۔"

"پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے ایک ہزار دینار دے دوں لیکن پھر بے ایمانی نے مجھے ورغلایا کہ ایک ہزار دینار تو بہت زیادہ ہیں، اگر دینے ہی ہیں تو بیس درہم دے کر یہ لعل ہتھیا لو۔ حال آں کہ میں اچھی طرح جانتا تھا بیس درہم میں تو ایک معمولی موتی بھی نہیں ملتا، چہ جائے کہ اتنا بیش قیمت لعل جس کی قیمت کم از

کم ایک لاکھ سونے کی اشرفیاں ہوں۔“

”غرض میں نے صندوق کھول کر بیس درہم کے سِکّے نکالے اور اس شخص کے ہاتھ میں تھما دیے۔ اس نے انتہا حیرت و تعجّب سے پہلے اُن بیس درہم کے سکّوں کو دیکھا پھر میری جانب تکنے لگا۔“

”جنابِ عالی، کیا صرف بیس درھم عنایت فرمایئے گا؟“ اس نے پوچھا۔ ”اس لعل کی قیمت صرف بیس درھم؟“

”تو اور کیا ساری دُکان تمھیں دے دوں؟“ میں نے ناراض ہو کر کہا۔ ”اگر یہ قیمت منظور نہیں تو جاؤ راستہ ناپو۔ آجاتے ہیں صُبح صُبح پریشان کرنے کے لیے۔“

”وہ کوئی بہت ہی شریف اور غیرت مند آدمی تھا۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری، مجھے سلام کیا اور بیس درھم کی معمولی رقم وصول کر کے چلا گیا۔“

"اس کے جاتے ہی میں نے جھپٹ کر لعل اُٹھایا، اُسے چُوما اور جھٹ سے اپنی تجوری میں بند کر دیا۔ واہ رے میرے مولیٰ! صُبح صُبح ہی کیسے زبردست نفع کا دھندا کرا دیا۔ اب میں اسی لعل کے عوض ڈیڑھ لاکھ سونے کی اشرفیاں بڑی آسان سے جب چاہے حاصل کر سکتا تھا۔"

"اس کے دو دن بعد کا ذکر ہے، میں مُنہ اندھیرے اپنی دُکان پر آیا۔ اس وقت سارا بازار بند تھا۔ میں ہی ایسا دُکان دار تھا جو سُورج نکلنے سے بھی پہلے دُکان کھولنے کا عادی تھا تا کہ گاہک سب سے پہلے میری دُکان ہی پر آئے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے باہر سڑک پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سُنی۔ یہ سمجھ کر کہ شاید کون گاہک آیا ہے، میں نے دُکان سے باہر جھانکا۔ کیا دیکھا کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار چلا آتا ہے۔ میری دُکان کے سامنے پہنچتے ہی یکایک وہ گھوڑے کی پیٹھ پر سے زمین پر گِرا اور کوئی آواز نکالے بغیر مر گیا۔"

"سوار کے گِرتے ہی کئی راہ گیر اور کام کاج پر جانے والے مزدور اور ایسے ہی

دوسرے آدمی دوڑے ہوئے آئے اور آتے ہی مجھے گھیر لیا۔ کیوں کہ بد قسمتی سے میں گھڑ سوار کے گِرتے ہی اپنی دُکان سے نِکل کر اُس کے قریب پہنچ گیا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ جو کچھ اس کی جیب میں ہو گا وہ نکال کر اپنے قبضے میں کر لوں گا۔"

"ان لوگوں نے آتے ہی مُجھ پر حملہ کر دیا۔ کوئی جوتے مارنے لگا، کسی نے گھونسے لگائے اور کوئی مجھے لکڑی سے پیٹنے لگا۔ وہ سب ایک آواز ہو کر یہی کہتے تھے کہ گھڑ سوار کو تم نے مارا ہے۔ میں لاکھ دہائی دیتا کہ میں نے اسے مارنا تو ایک طرف، ہاتھ تک نہیں لگایا، لیکن کسی نے میری ایک نہ سُنی۔ آناً فاناً لوگوں نے میری مُشکیں باندھ لیں۔ میں نے اپنے تاجر بھائیوں اور دوسرے اُن دُکانداروں کو مدد کے لیے پُکارا جو اپنی اپنی دکانیں کھول چکے تھے، لیکن کوئی مدد کے لیے نہ آیا۔ سب دُور کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ دراصل وہ سب میری بے ایمانیوں اور دھوکے سے اچھّی طرح واقف ہو چکے تھے اور مجھ سے نفرت کرنے لگے تھے۔"

”اِتنے میں شہر کا کوتوال سپاہیوں سمیت آگیا، وہ بھی مجھ سے جلتا تھا کیوں کہ ایک موقع پر میں نے اُس کی بیوی سے سونے کے ایک ہار کی چار گُنا قیمت وصول کی تھی۔ کوتوال نے آتے ہی پہلے تو میری خوب ٹھکائی کی، پھر گرفتار کر کے شہر کے حاکم کی عدالت میں لے گیا۔“

”شہر کا حاکم نہایت بد معاش اور بے ایمان آدمی تھا۔ ایک مرتبہ وہ میری دُکان پر آیا تھا اور حکومت کا رُعب جتا کر کچھ جواہرات لے جانے کی کوشش کی تھی، مگر میں نے اُسے بے عزّت کر کے نِکال دیا تھا۔ اب جو اُس نے مُجھے اس حال میں دیکھا تو بہت خوش ہوا اور یہ سُن کر کہ میں نے گھُڑ سوار کو جان سے مار ڈالا ہے، فوراً میرے سزائے موت کا حکم سُنا دیا۔ میں نے اس کی بڑی منت سماجت کی بہت قسمیں کھائیں کہ میں تو اس گھڑ سوار کو جانتا تک نہیں اور نہ میری اس سے کوئی دشمنی تھی۔ میں اسے کیوں ہلاک کرتا۔ مگر حاکم نے میری کسی بات پر کان نہ دھرا اور جلّاد کو بُلا کر مجھے اس کے حوالے کر دیا۔“

"قتل کے مجرم کو سورج نکلنے سے پہلے موت کے گھاٹ اُتارا کرتے تھے۔ چناں چہ جلّاد نے مُجھے موت کی کوٹھڑی میں رات بھر کے لیے بند کر دیا۔ میں اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو چکا تھا کہ یکایک آدھی رات کے وقت کوٹھڑی کا دروازہ کھُلا اور شہر کا حاکم اندر داخل ہوا۔ میں اُسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اکیلا ہی آیا تھا اور جلّاد کو اُس نے دروازہ کھلوا کر رُخصت کر دیا تھا۔"

"جناب، خُدا کے لیے مُجھ بے گناہ پر رحم کیجیے۔ میں جھٹ اُس کے قدموں پر گِر پڑا۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔"

"آہاہاہاہا۔۔۔!" حاکم نے قہقہہ لگایا۔ "تم بہت بد معاش اور بے ایمان آدمی ہو۔ ہم تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں تو مُدّت سے اِس فکر میں تھا کہ تم کِسی طرح میرے پھندے میں پھنسو۔ اب صُبح سُورج نکلنے سے پہلے پہلے تمہاری گردنِ اُڑا دی جائے گی۔"

”حضُور، میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔ ایک روز آپ میری دُکان پر تشریف لائے تھے اور میں آپ سے گُستاخی کے ساتھ پیش آیا تھا، اس کی معافی چاہتا ہوں۔“

”نِری معافی سے کام نہ چلے گا، بے وقوف جوہری حاکم نے مجُھے دھمکاتے ہوئے کہا۔ ہم نے سُنا ہے تو نے بڑی دولت جمع کر لی ہے۔ کچھ اُس میں ہمارا بھی حصّہ ہے یا نہیں؟“

”اب میں اس کمینے کا مطلب سمجھا۔ وہ مجھ سے جان بخشی کی رشوت مانگ رہا تھا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: میری دولت آپ ہی کی ہے، جناب۔ جو حکم کریں پیش کر دوں۔“

”ٹھیک ہے۔ وہ ہنس کر بولا۔ اب آئے سیدھی راہ پر۔ اسی وقت منہ پر کپڑا لپیٹ کر ہمارے ایک آدمی کے ساتھ اپنی دُکان پر جاؤ، اور ایک لاکھ اشرفیوں کے جواہر تھیلی میں بند کر کے اُس کے حوالے کرو۔ پھر صُبح ہماری عدالت میں پیش

ہونا۔ رحم کی ایک درخواست تمہاری جانب سے عدالت میں دی جائے گی۔ ہم نے چند گواہوں کا انتظام کیا ہے جو یہ گواہی دیں گے تم نے اس گھڑ سوار کو ہلاک نہیں کیا۔ اس کے بعد ہم تمہاری رہائی کا حکم دے دیں گے۔"

"اور یوں اس مُوذی حاکم کو ایک لاکھ اشرفوں کے ہیرے و جواہر رشوت میں دے کر میں نے اپنی جان بچائی۔"

"اس واقعے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں نصیحت پکڑتا اور آیندہ کے لیے دھوکے، فریب اور بے ایمانی سے توبہ کر لیتا، لیکن ہوا یہ کہ پہلے سے بھی زیادہ دولت کمانے کا لالچ بھُوت بن کر مجھ پر سوار ہو گیا، شہر کے حاکم کو ایک لاکھ اشرفیوں کے جو ہیرے میں نے دیتے تھے، اس نقصان کو جلد سے جلد پورا کرنے کی دُھن لگی ہوئی تھی۔ میں نے طے کر لیا کہ جب تک اِتنی رقم نہیں کما لوں گا، ایمان داری کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دوں گا۔"

”ایک دن کا ذکر ہے، میں اپنی دُکان پر بیٹھا تھا کہ دو عورتیں زرق برق لباس پہنے دُکان کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ ایک عورت کی گود میں چھوٹا سا بچّہ تھا جسے اس نے کپڑا اوڑھا رکھا تھا، دوسری عورت کے ہاتھ میں ایک خوب صورت تِنکوں کی بنی ہوئی ٹوکری تھی۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ ان کی آواز میرے کانوں کی آسانی سے پہنچ رہی تھی۔“

”بچّے والی عورت نے اپنی قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بہت سی سونے کی اشرفیاں نکال کر دوسری عورت کو دیتے ہوئے بولی:“

”یہ اشرفیاں لے جاؤ اور حاجی جلال جوہری کی دُکان پر جا کر اسے دے دو۔ کہنا کہ خانم نے یہ اشرفیاں بھیجی ہیں۔ کل تم جو اُس کے ہاں سے چند انگوٹھیاں اور ہار وغیرہ لے کر آئی تھیں نا، یہ اُن چیزوں کی آدھی قیمت ہے، حاجی جلال سے کہنا کہ باقی رقم کل ضُرور پہنچ جائے گی۔ اب جن جن زیوروں کی ہمیں ضُرورت ہے، حاجی سے کہنا کہ جلد تیّار کر دے۔ کیوں کہ شادی میں اب دس ہی دن باقی رہ

گئے ہیں۔ میں یہیں رُک کر تمہارا اِنتظار کر رہی ہوں۔ جلدی اس کا جواب لے کر آنا کہ وہ کب تک نئے زیور تیّار کرادے گا۔"

"خانم سے اشرفیاں لے کر دوسری عورت چلی گئی۔ میں نے سوچا، یہ عورت بڑی مال دار معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ اُس نے جیب سے اشرفیاں نکال کر گنے بغیر ہی دوسری عورت کو دے دی تھیں، ان کے گھر میں کِسی کی شادی کی تیّاریاں ہیں اور حاجی جلال جوہری سے اِسی لیے زیور کی فرمائش کی گئی ہے۔ چناں چہ میں نے بڑے ادب سے اُن کو سلام کہا اور کہا۔ اے معزّز خاتون، آپ وہاں سڑک پر کب تک کھڑی رہیں گی۔ یہاں میری دُکان میں آ کر بیٹھ جائیے۔"

"یہ سنتے ہی وہ عورت کچھ شرمائی۔ پھر جھجکتی ہوئی آئی اور دُکان کے بیرونی حصّے میں بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔"

"معزّز خاتون، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ حاجی جلال جوہری سے آپ نے کون

کون سے زیور کِن کِن داموں خریدنے ہیں؟ یہ میں اِس لیے پوچھ رہا ہوں کہ حاجی جلال کچھ اچھا تاجر نہیں ہے۔ وہ زیادہ رقم وصول کرنے میں بہت بدنام ہے۔"

"اچھا! یہ بات ہے۔ عورت نے حیرت سے کہا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ ہم نے تو اُس سے بہت سی چیزیں خریدی ہیں۔ کپڑے ہیرے، جواہر اور سونا وغیرہ۔ اصل میں میری چھوٹی بہن کی شادی وزیر کے لڑکے سے ہونے والی ہے۔ دس دن شادی میں باقی ہیں اور ابھی بُہت سا زیور اور کپڑا خریدنا ہے۔ کل ہم نے حاجی جلال کی دُکان سے زیور خریدا تھا۔ بعض جواہرات ہمیں پسند نہیں آئے، اس نے کہا تھا کہ ایک دو دن میں عمدہ عمدہ ہیرے آئیں گے۔ پھر آن کر لے جایئے گا۔"

"عورت کی یہ باتیں سُن کر میری رال ٹپکنے لگی۔ میں نے سوچا، گاہک بہت امیر معلوم ہوتا ہے، اگر اس کے ہاتھ میں اپنے ہیرے جواہر بیچوں تو ہزاروں کے

وارے نیارے ایک آن میں کر سکتا ہوں، یہ سوچ کر میں نے کہا:"

"مُحترم خاتون، اگر آپ حکم دیں تو میں ایسے نفیس اور قیمتی جواہرات آپ کی خدمت میں پیش کروں، جو یہاں کسی جوہری کے پاس آپ کو نہ ملیں گے۔ قیمت کی آپ فکر نہ کیجیے۔ جس قدر ممکن ہو سکا، قیمت میں رعایت کر دوں گا۔"

"یہ سُنتے ہی اُن عورت نے خوش ہو کر کہا:"

"ہاں ہاں، ضرور دکھایئے۔ اگر پسند آئے تو خرید لوں گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ خریدنے سے پہلے میں یہ جواہر اپنے مکان پر بھیجوں گی تاکہ میری بہن بھی پسند کرلے۔ جس کی شادی ہونے والی ہے۔ خُدا کرے اُسے آپ کے دکھائے ہوئے ہیرے جواہرات پسند آجائیں۔ پھر تو ہم مُنہ مانگی قیمت پر بھی خرید لیں گے۔"

"خانم کی یہ بات سُن کر مارے لالچ کے میرے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا:"

”محترم خاتون، جو ہیرے اور زیور میں آپ کو دکھاؤں گا، وہ سب کے سب لاجواب اور بیش قیمت ہیں۔ جیسا کہ میں نے کہا، پورے بازار میں کسی اور جوہری کے پاس اتنا عمدہ اور نفیس مال نہ ہو گا۔ ہم ایسی چیز آپ ہی جیسے قدر دانوں کے لیے سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں، اور ہر آنے والے گاہک کو دکھاتے بھی نہیں۔“

”ابھی میں یہ چکنی چپڑی باتیں کر ہی رہا تھا کہ دوسری عورت واپس آ گئی۔ اس نے ایک خوب صورت موتیوں کا ہار نکال کر خانم کو دیتے ہوئے کہا:“

”حاجی جلال نے یہ ہار تیّار کر کے دے دیا ہے اور وہ سلام عرض کر کے کہتا ہے کہ انشااللہ باقی زیور کل پرسوں تک ضرور تیّار ہو جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ قیمت کی اُسے اتنی جلدی نہیں ہے، جب جی چاہے، رقم بھجوا دیجیے گا۔“

”خانم نے بے پروائی سے دوسری عورت کی یہ بات سُنی اور ہار کو اُلٹ پلٹ کر

دیکھتے ہوئے بولی:"

"اونہہ !نہ بھی کوئی ہار ہے، مجھے یقین ہے کہ دُلہن اسے کبھی پسند نہ کرے گی۔ جی تو چاہتا ہے اسے ابھی حاجی صاحب کے پاس واپس بھجوا دوں، مگر یہ خیال کر کے رکھ لیتی ہوں کہ ان سے ہمارا پرانا لین دین ہے۔ اچھا خیر، اب آپ مہربانی فرما کر وہ جواہر دِکھایئے جن کا ذکر آپ نے مجھ سے کیا ہے۔"

"ابھی کیجیے۔۔۔ ابھی لیجیے۔" میں نے جلدی سے کہا اور تجوری کھول کر ہاتھی دانت کا بنا ہوا حسین ڈبّا نِکالا۔ اس ڈبّے کے اندر ہی وہ نادِر ہیرے رکھے ہوئے تھے۔ ان ہی ہیں وہ لعل بھی تھا جو میں نے ایک مُصیبت زدہ سے صرف بیس درھم میں ہتھیا لیا تھا۔"

"دونوں عورتیں حیرت، دلچسپی اور خوشی سے ہیرے دیکھتی رہیں۔ ہر ہیرے کی قیمت پوچھتی جاتی تھیں۔ میں بھلا کہاں چوکنے والا تھا۔ میں نے بھی خوب بڑھ

چڑھ کر قیمتیں بتائیں۔ اس لعل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خانم نے کہا۔“

”کتنا خُوب صُورت پتھّر ہے۔ کیسی چمک دمک ہے! بھئی یہ تو بہت قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں جناب، کیا قیمت ہو گی اس کی؟“

”محترم خاتون، ایسا پتھّر دنیا میں کہیں نہ ملے گا۔ خاص شہنشاہ تُرکی کے خزانے کا ہے، وہاں سے ایک شہزادہ نہ جانے کیسے اُڑا لایا اور میرے ہاتھ بیچ گیا۔ بس اس کی قیمت تو نہ پوچھئے۔ اسے لے جایئے۔“

”پھر بھی، کچھ تو بتایئے نا۔ اس نے اصرار کیا۔“

”صرف دو لاکھ اشرفیاں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ میرا خیال تھا کہ اتنی بڑی قیمت سُن کر وہ مایوس ہو جائے گی، لیکن اس نے خوش ہو کر کہا:

”صرف دو لاکھ اشرفیاں! ہمیں یہ قیمت منظور ہے، جناب۔ اِن داموں تو ہر لعل

بے حد سستا ہے۔"

"قِصّہ مُختصر اس خاتون نے لعل کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے جواہرات اور موتی بھی پسند کیے۔ میں نے اس کے پسند کیے ہوئے جواہر اُسی ہاتھی دانت کے ڈبّے میں احتیاط سے رکھ دیے۔ اس کے بعد عالم نے مجھ سے کاغذ اور قلم مانگا۔ میں نے دونوں چیزیں پیش کیں۔ اس نے کاغذ پر کچھ لکھ کر وہ جواہر کے ڈبّے سمیت، اپنی ساتھی عورت کو دیا اور کہنے لگی۔"

"اب تم جلدی سے یہ جواہر گھر لے جاکر بہن کو دکھالاؤ۔ مُجھے اندیشہ ہے کہ ان میں سے کئی موتی اور ہیرے وہ ناپسند کر کے واپس بھیج دے گی، لیکن یہ لعل اُسے ضُرور پسند آجائے گا۔ جب تک تم واپس آؤ، میں یہیں دُکان پر بیٹھتی ہوں۔ یہ کہہ کر مُجھ سے بولی۔ جناب، اگر آپ کو بھروسا نہ ہو تو اپنا کوئی آدمی اس عورت کے ساتھ ہمارے مکان پر بھیج سکتے ہیں۔"

”جی نہیں، محترم خاتون۔ میں نے جلدی سے کہا۔ یہ آپ کیا فرماتی ہیں! آپ پر مجھے اعتماد ہی اعتماد ہے۔ نہایت اِطمینان سے یہ جواہر اپنے گھر پسند کروانے کے لیے بھجوا دیجیے۔“

”غرض دوسری عورت جواہر کا ڈبّہ لے کر چلی گئی اور خانم میری دُکان پر بیٹھی رہی۔ میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ یکایک دو راہ گیروں میں میری کان کے عین سامنے کسی بات پر تکرار ہوئی۔ پہلے تو وہ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے رہے، پھر ہاتھا پائی شروع ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے تلواریں نکال لیں۔ دیکھتے دیکھتے تماشائیوں کا ایک ہجوم میری دُکان کے آگے جمع ہو گیا۔ غُل غپاڑے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اتنے میں کوتوالی سپاہیوں کے ساتھ نمودار ہوا۔“

”اس نے آتے ہی دونوں لڑنے والوں کو گرفتار کر لیا اور حاکم کی عدالت میں لے چلا۔ جاتے جاتے اِرد گرد کے چند دُکان داروں کو بھی گواہی دینے کے لیے اپنے

ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ یہ جھگڑا عین میری دُکان کے سامنے ہوا تھا، اس لیے کوتوال نے زبردستی مجھے بھی گواہی کے لیے دوسرے لوگوں میں شامل کر لیا۔ جب میں نے جانے سے انکار کیا تو اس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں اور گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگا۔ یہ دیکھ کر خاتون نے جو اس وقت تک اطمینان سے اپنے بچّے سمیت دُکان ہی میں بیٹھی تھی، مجھ سے کہا۔"

"جناب آپ حاکم کی عدالت میں جا کر گواہی دے آئیں۔ میں یہیں بیٹھتی ہوں۔"

"چلتے چلتے میں نے پڑوس کی ایک دُکان پر بیٹھنے والے قصائی سے کہا کہ وہ عورت جو میری دُکان پر بیٹھی ہے۔ ذرا اس پر نگاہ رکھنا۔ قصائی کو کچھ خبر نہ تھی کہ معاملہ کیا ہے اور وہ عورت دُکان پر کِس لیے بیٹھی ہے۔ اُس نے سوچا شاید

اس لیے دُکان کی نگرانی کو کہتا ہے کہ وہ عورت کوئی چیز نہ اُٹھا لے، اس نے مجھ

سے کہہ دیا کہ وہ عورت پر نگاہ رکھے گا۔"

"حاکم کی عدالت میں گواہی دے کہ جب میں واپس اپنی دُکان پر آیا تو دُور ہی سے یہ دیکھ کر دل دھک دھک کرنے لگا کہ وہ خاتون دُکان پر نہیں ہے۔ البتّہ اس کا ننھا سا بچّہ ایک کمبل میں لپٹا ہوا گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے قصائی سے پوچھا کہ وہ عورت کہاں گئی۔ اس نے کہا:"

"تمہارے جانے کے بعد وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں تھوڑی دیر کے لیے حاجی جلال جوہری کی دُکان پر ایک کام سے جا رہی ہوں۔ اپنا بچّہ یہیں چھوڑے دیتی ہوں۔ تم مہربانی کرکے اس کا دھیان رکھنا۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔"

"اسے گئے ہوئے کتنی دیر ہوئی؟ میں نے پوچھا۔"

"بہت دیر ہو گئی۔" قصائی نے جواب دیا۔

”میں نے دُکان میں جا کر کمبل میں لپٹے ہوئے بچّے کو دیکھا تو پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ وہ چینی مٹّی کا بنا ہوا کھلونا تھا۔ میں نے اسی وقت دُہائی مچا دی کہ دوڑو! بھاگو! میں لُٹ گیا۔۔۔ برباد ہو گیا۔ لیکن اس فریاد کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ وہ فریبی عورتیں نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ میں نے قصائی کو غصّے میں گالیاں دیں اور کہا کہ جب میں کہہ کر گیا تھا کہ عورت پر نگاہ رکھنا تو تم نے اُسے جانے کیوں دیا۔ قصائی نے جواب دیا کہ میں تمہارا نوکر نہیں تھا جو اپنا کام چھوڑ کر عورت کو دیکھتا رہتا۔ اس کا جواب سُن کر میرا پاگل پن انتہا کو پہنچنے لگا۔ لپک کر اس کی دُکان سے گوشت کاٹنے کا چھُرا اُٹھایا اور اُس پر حملہ کر دیا۔ قصائی بُری طرح زخمی ہوا اور وہیں پر مر گیا۔ یہ دیکھتے ہی لوگ دوڑے دوڑے آئے اور مجھے پکڑ کر حاکم کی عدالت میں لے گئے۔“

”حاکم نے سارا قصّہ سُن کر حکم دیا کہ اس بے رحم جوہری کو جلّاد کے حوالے کیا جائے۔ لیکن لوگوں نے اس سے درخواست کی کہ یہ شخص پاگل ہو چکا ہے۔ اسے جان سے مارنا درست نہ ہو گا۔ اس کے لیے یہی سزا بہت ہے کہ اس کی تمام

جائیداد اور مال اسباب ضبط کر کے اسے شہر سے باہر نکال دیا جائے۔ یہ مشورہ حاکم کو بہت پسند آیا۔ اسی وقت حکم دیا کہ میرا تمام مال اسباب، مکان اور دُکان ضبط کی جائے، یہاں تک کہ تن کے کپڑے بھی اُتار لیے جائیں۔ حاکم کے کارندوں نے سب کچھ چھین کر مجھے شہر بدر کر دیا۔ میں خوب رویا پیٹا، مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔"

"دس روز تک میں شہر کے باہر ویرانے میں بھوکا پیاسا اور ننگ دھڑنگ آسمان کے نیچے پڑا رہا۔ گیارہویں دن جب کہ بھوک پیاس کے ہاتھوں میری جان لبوں پر تھی۔ صحرا کی جانب سے ایک اونٹ سوار آیا اور میرے پاس آن کر اُونٹ سے اُترا۔ اُس نے مجھے کھانے کے لیے کھجوریں دیں، پینے کو پانی دیا اور پہننے کو کپڑوں کا ایک جوڑا دیا۔ کھجوریں کھا کر اور پانی پی کر میری جان میں جان آئی اور میں نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مسکرا کر کہا:"

"کیوں میاں جوہری، تم نے مجھے پہچانا؟"

”میں نے غور سے اس کی صورت دیکھی، لیکن کچھ یاد نہ آیا کہ اسے کہاں دیکھا تھا! البتّہ صُورت جانی پہچانی لگتی تھی۔ میں نے کہا:“

”بھائی ایسا لگتا ہے کہ تمھیں اس سے پہلے کہیں دیکھا ضرور ہے۔ مگر کہاں یہ یاد نہیں آتا۔“

”یہ سن کر وہ ہنسا اور کہنے لگا: ”میاں جوہری، تمھیں وہ پھٹے حالوں آدمی یاد ہے جو ایک راز صُبح صُبح تمہاری دُکان پر ایک لعل بیچنے کے لیے آیا تھا اور تم نے بیس درہم کے بدلے میں وہ بیش قیمت لعل اس سے خریدا تھا۔؟“

”دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بے شک یہ اجنبی وہی تھا۔ میں نے جھُک کر اس کے قدموں پہ سر رکھنا چاہا، لیکن وہ اُچھل کر پرے ہٹ گیا، پھر اُس نے اپنی جیب سے مخمل کی ایک تھیلی نکال کر اس کا مُنہ کھولا۔ تھیلی کا مُنہ کھلتے ہی اس میں سے سینکڑوں ہزاروں ویسے ہی لعل نکل کر زمین پر بکھر گئے جیسا ایک

لعل اُس اجنبی نے بیس درہم میں میرے ہاتھ بیچا تھا۔ اجنبی نے قہقہہ لگا کر کہا:"

"میاں جوہری، میں تمہاری دیانت اور ایمان داری پرکھنے کے لیے خستہ حالت بنا کر تمہاری دُکان پر گیا تھا۔ اگر تم بے ایمانی نہ کرتے اور مجھے اُس لعل کی صحیح صحیح قیمت ادا کرتے تو میں انعام کے طور پر یہ تھیلی تمہیں دے دیتا، مگر تم نے بے ایمانی اور دھوکے سے کام لیا۔ اس کا نتیجہ بھی تم نے دیکھا کہ سب کچھ تم سے چھین لیا گیا اور تم اِن حالوں کو پہنچ گئے۔"

"حضُور، آپ کون ہیں؟ میں نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔"

"میں جِنوں کا بادشاہ ہوں۔ کئی ہزار جن میرے غُلام ہیں۔ میرا مشغلہ یہ ہے کہ سارا دن شہروں میں گھومتا ہوں۔ جو شخص مجھے محنتی، ایمان دار اور سچّا دکھا دیتا ہے، اس کی خدا کے حکم سے مدد کرتا ہوں۔ میں نے ہی تمہارے باپ کی مدد کی تھی اس لیے کہ وہ سچّا اور کھرا آدمی تھا۔ لیکن تم نے فریب اور دھوکے پر کمر

باندھ لی تھی، اس لیے تمھیں سزا دینا ضروری تھا۔"

"جِنوں کے بادشاہ کی یہ بات سُن کر میں نے ہر طرح رونا اور چلّانا شروع کر دیا کہ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ آیندہ عہد کرتا ہوں کہ کبھی کسی کو دھوکا نہ دوں گا۔ کسی سے فریب نہ کروں گا۔ میری دولت واپس کر دی جائے، لیکن یہ رونا دھونا سب بے کار گیا۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو جِنوں کا بادشاہ غائب ہو چکا تھا۔"

"وہ دن اور آج کا دن، در در بھیک مانگنا میرا مقدر ہے۔ آہستہ آہستہ میری آنکھوں نے بھی جواب دے دیا اور میں اندھا ہو گیا۔ اب تبریز کے بازاروں اور گلی کوچوں میں بھیک مانگتا ہوں اور لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ میرا حال دیکھ کر عِبرت حاصل کریں۔ جو شخص بھی سچّائی، دیانت اور ایمان داری کا راستہ چھوڑ کر دھوکے، فریب اور بے ایمانی کا راستہ اختیار کرتا ہے، وہ ہمیشہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اس کے لیے رسوائی ہے۔ خدا میرے گناہ معاف کرے اور میری خطائیں بخش دے۔"

بادشاہ کی انگوٹھی

ایران کے ایک بادشاہ کی عادت تھی کہ وہ راتوں کو بھیس بدل کر نکلتا تاکہ اپنی رعایا کے حالات معلوم کرے کہ کون خُوش ہے اور کون ناراض۔ ایک رات بادشاہ فقیرانہ لباس پہن کر محل سے نکلا اور بازاروں میں گھومتا پھرتا ایک نان بائی کی دُکان کے قریب سے گزرا۔ دُکان کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ بادشاہ نے چپکے سے اندر جھانکا، کیا دیکھتا ہے کہ نان بائی مُصلّے پر بیٹھا دُعا مانگ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور وہ کہہ رہا ہے:

”اے پروردگار! تُو ہی ہمارا پیدا کرنے اور پالنے والا ہے۔ ہمیں ہر دم تیرا ہی آسرا ہے، اور تجھی پر بھروسا کرتے ہیں۔ تُو بڑا قادر اور حکمت والا ہے۔ جو کچھ تو چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے، ہم تیرے حکم کے آگے گردن جھکاتے ہیں اور تیری

رضا کے بندے ہیں۔"

نان بائی بار بار یہی الفاظ دُہرا رہا تھا۔ بادشاہ اُس کی یہ حالت دیکھ کر نہایت حیران ہوا اور دل میں کہنے لگا کہ خدا کا ایسا فرماں بردار اور عبادت گزار بندہ میں نے اپنی رعایا میں آج تک نہیں دیکھا، مگر سوال یہ ہے کہ جو الفاظ یہ نان بائی اپنے مُنہ سے نکال رہا ہے، ان پر عمل بھی کرتا ہے؟ مجھے چاہیے کہ اس کا امتحان کروں اور دیکھوں کہ وہ کس قدر خدا پر بھروسا کرنے والا ہے۔ اگر یہ اس امتحان میں پورا اُترا تو میں اس کی وہ عزّت افزائی کروں گا کہ تمام رعایا میں سے آج تک کسی کی نہ کی ہو گی۔

یہ سوچ کر بادشاہ نے دُکان کا دروازہ کھٹکھٹا۔ نان بائی نے مُصلّٰی تہہ کیا اور اُٹھ کر دیکھا۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں بادشاہ اس وقت فقیر کے بھیس میں تھا، نان بائی نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

”کیوں بھائی، تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

”میاں نان بائی، ہم فقیر ہیں۔ ابھی ابھی تمہارے شہر میں داخل ہوئے ہیں۔ ہمیں کھانے کو روٹی دو، لیکن روٹی کی قیمت ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ ہاں۔ یہ انگوٹھی ہم تمہیں دیتے ہیں۔ اسے بطور امانت رکھ لو۔ جب ہم روٹی کی قیمت دینے آئیں گے تب اپنی انگوٹھی واپس لے لیں گے۔“

نان بائی نے کچھ کہے بغیر انگوٹھی لے کر ایک روٹی فقیر کو دے دی اور دُعائیں دیتا چلا گیا۔ نان بائی نے فقیر کے سامنے ہی وہ انگوٹھی اپنے ریزگاری والے صندوقچے میں بے پروائی سے ڈال دی۔

صُبح ہوتے ہی بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ فلاں محلے میں ایک نان بائی کی دُکان ہے۔ اس دُکان پر جاؤ اور اس کے ریزگاری والے صندوقچے میں سے ہماری انگوٹھی کسی ترکیب سے نکال لاؤ۔ خبردار! نان بائی کو بالکل خبر نہ ہو کہ انگوٹھی

کہاں گئی۔

وزیر نے دو سپاہیوں کو ساتھ لیا اور اس بازار میں جا پہنچا جہاں نان بائی کی دُکان تھی۔ اُس نے دُکان داروں کے باٹ دیکھنے شروع کیے اور کہا کہ ہمیں علم ہوا ہے کہ بعض دُکان داروں کے باٹ درست نہیں ہیں اور وہ گاہکوں کو چیزیں کم توں کر دیتے ہیں۔

وزیر اِسی طرح مُعاینہ کرتا ہوا نان بائی کی دُکان پر گیا اور اس کے باٹ دیکھے۔ وہ سب صحیح تھے۔ وزیر نے کہا۔

”میاں نان بائی، تمہاری وہ ترازو کہاں ہے جس ست تم آٹا تولتے ہو؟“

نان بائی نے جواب دیا۔ ”حضُور، وہ ترازو تو دُکان کے پچھلے حصّے میں رکھی ہے۔ ابھی حاضر کرتا ہوں۔“

جوں ہی نان بائی دُکان کے پچھلے حصّے میں گیا، وزیر نے پھُرتی سے صندوقچہ کھول کر بادشاہ کی انگوٹھی نکالی اور جیب میں رکھ لی۔ اتنے میں نان بائی ترازو لے کر آ گیا، وزیر نے یوں ہی سرسری طور پر ترازو کو دیکھا بھالا اور یہ کہہ کر اگلی دُکان پر چلا گیا کہ تمہارے سب باٹ اور ترازو ٹھیک ٹھاک ہیں۔

وزیر نے بادشاہ کو انگوٹھی لے جا کر دی۔ بادشاہ نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی، پھر ایک غلام کو بھیجا کہ نان بائی کو بُلا لائے۔ نان بائی اسی وقت بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ تو وہی شخص ہے جو پچھلی رات فقیر کے بھیس میں آیا تھا۔ بادشاہ نے کہا:

”میاں نان بائی، معاف کرنا۔ پچھلی رات ہم ہی بھیس بدل کر تمہارے پاس آئے تھے اور روٹی کے بدلے میں اپنی انگوٹھی گروی رکھ کر چلے گئے تھے۔ اب مہربانی کر کے اپنی روٹی کی قیمت لے لو اور ہماری انگوٹھی واپس کرو۔“

یہ سن کر نان بائی بھاگا بھاگا اپنی دُکان میں گیا۔ صندوقچہ کھولا تو انگوٹھی ندارد تھی۔ الٹے قدموں واپس آیا اور بادشاہ سے عرض کیا:

"جہاں پناہ، وہ انگوٹھی آپ کے سامنے ہی میں نے اپنے صندوقچے میں ڈال دی تھی، معلوم ہوتا ہے کوئی چور چرا کر لے گیا ہے۔ میں حاضر ہوں، جو سزا کہیے، بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

"انگوٹھی نہیں ہے!" بادشاہ نے غصّے سے کہا۔ "ضرور تم جھوٹ بول رہے ہو۔ دیکھو، دس دن کے اندر اندر انگوٹھی پیش کر کے اپنی روٹیوں کی قیمت لے جاؤ، اگر اس مُدّت میں تم انگوٹھی پیش کرنے سے قاصر رہے تو تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اب تم جاسکتے ہو۔

"بہت بہتر، عالی جاہ۔" نان بائی نے کہا۔ "خدا ہر شے پر قادر ہے اور مجھے اس کی ذات پر پورا پورا بھروسا ہے کہ وہ مجھے رُسوا نہ کرے گا۔ انشا اللہ آپ کی انگوٹھی

میں دس دن کے اندر اندر پیش کر دوں گا۔"

یہ کہہ کر نان بائی نے سلام کیا اور رُخصت ہو گیا۔ بادشاہ کو اس کے اِطمینان اور سکون پر از حد تعجّب ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ انگوٹھی تو میں اپنی انگلی میں پہنتے ہوئے ہوں، پھر دس دن کے اندر اندر یہ بے وقوف کہاں سے انگوٹھی لائے گا۔

آٹھ دن گُزر گئے۔ بادشاہ نے شکار کا ارادہ کیا اور جنگل میں نکل گیا۔ ایک ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالا تو وہ سیدھا دریا کی طرف گیا۔ بادشاہ نے اُس کا پیچھا کیا۔ عین دریا کے کنارے بادشاہ کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور بادشاہ قلابازی کھا کر غڑاپ سے دریا میں جا ِگرا۔ بڑی مشکل سے ہاتھ پاؤں مار کر دریا سے نکلا اور کنارے پر آیا۔ ہاتھ کیچڑ میں بھر گئے تھے۔ کنارے پر بیٹھ کر ہاتھ دھونے لگا تو دیکھا کہ انگوٹھی انگلی سے نکل کر دریا میں گر پڑی ہے۔ بادشاہ کو بھلا ایسی انگوٹھی کی کیا پرواہو سکتی تھی۔ اس کے خزانے میں ہزاروں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر انگوٹھیاں موجود تھیں۔

دریا کے اُسی کنارے پر کچھ دُور ایک غریب مچھیرا جال لگائے صُبح سے بیٹھا تھا اور ابھی تک کوئی مچھلی نہیں پھنسی تھی۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا کہ اگر خالی ہاتھ گیا تو بال بچّے بھوکے ہی سوئیں گے۔ تھوڑی دیر بعد جال ہلا، مچھیرے نے کھینچا تو خاصا وزن محسوس ہوا۔ وہ خوش ہوا کہ آج تو بہت مچھلیاں پھنسیں۔ جب جال دریا سے باہر نکالا تو اس میں دو بڑی بڑی مچھلیاں تڑپ رہی تھیں۔ مچھیرے کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اُس نے سوچا اِن مچھلیوں کی اچھی قیمت ملے گی۔ جب وہ "تازہ مچھلی لو، تازہ مچھلی لو کی آوازیں لگاتا ہوا بازار میں پہنچا تو نان بائی کے کان میں مچھیرے کی آواز آئی۔ اس نے بیوی سے کہا:

"اری او نیک بخت، مچھلی کھائے کتنے دن ہو گئے۔ ذرا لپک کر اِس سے مچھلی تو خرید لے۔"

بیوی نے جھنجھلا کر کہا۔ "اللہ تیری شان! آٹھ دن گُزر چکے ہیں اور بادشاہ کی انگوٹھی ابھی تک نہیں ملی۔ دو دن بعد جلّاد تمہارا سر قلم کر دے گا اور تمہیں مچھلی

کھانے کی سُوجھ رہی ہے۔"

"اللہ پر بھروسا رکھ نیک بخت۔ اگر میری زندگی باقی ہے تو انگوٹھی ضرور ملے گی۔ اور دنیا کی کوئی طاقت میرا سر قلم نہیں کر سکتی۔"

بیوی نے مچھیرے کو آواز دی اور اس سے دونوں مچھلیاں خرید لیں۔ وہ مچھلیوں کو باورچی خانے میں لے گئی۔ انہیں ایک تختے پر رکھا اور چھُری سے صاف کرنے لگی۔ جوں ہی اُس نے پہلی مچھلی صاف کر کے دوسری کا پیٹ چیرا، اس میں سے ایک چمکدار چیز باہر نِکل پڑی۔ بیوی نے اُٹھا کر دیکھا تو یہ سونے کی ایک خوب صورت انگوٹھی تھی جس کے بیچ میں ہیرا جگ مگ کر رہا تھا۔

انگوٹھی دیکھ کر وہ چِلاّئی۔ "ذرا جلدی سے یہاں آنا۔ دیکھو، مچھلی کے پیٹ میں سے کیا چیز نِکلی ہے۔"

نان بائی نے بیوی کے چِلاّنے کی آواز سُنی تو دوڑا دوڑا آیا۔ بیوی نے اُسے انگوٹھی

دکھائی۔ نان بائی نے اُسے پانی سے دُھویا اور صاف کیا۔ پہلی نظر ہی میں وہ پہچان گیا کہ یہ بادشاہ کی وہی انگوٹھی ہے جو ریز گاری کے صندوقچے میں سے گُم ہو گئی تھی۔ وہ فوراً سجدے میں گر پڑا اور دیر تک رو رو کر خُدا کا شکر ادا کرتا رہا۔

نان بائی اسی وقت شاہی محل کی جانب روانہ ہوا اور بادشاہ کو اپنی آمد کی اِطّلاع کرائی۔ بادشاہ نے آنے کی اِجازت دی۔ نان بائی بادشاہ کے سامنے گیا اور سلام کرنے کے بعد ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

بادشاہ نے کہا۔ ”جو مدّت ہم نے تمھیں دی تھی، اس کے ختم ہونے میں ابھی دو دن باقی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ہماری انگوٹھی تلاش نہیں کر سکے اور مزید مہلت لینے آئے ہو۔ لیکن ہم ایک دن کی بھی مہلت دینے کو تیّار نہیں۔

نان بائی نے بادشاہ کی بات کا کچھ جواب نہ دیا، اور آگے بڑھ کر وہی انگوٹھی اس کے قدموں میں رکھ دی۔ بادشاہ نے انگوٹھی پر نگاہ ڈالی تو حیرت سے اُچھل پڑا۔

وہ بار بار انگوٹھی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا تھا اور حیران ہوتا تھا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے جو دریا میں گری تھی یا کوئی اور ہے۔ لیکن نہیں، یہ اُسی کی انگوٹھی تھی۔

"خُدا کی پناہ! یہ انگوٹھی تمہیں کہاں سے ملی؟" بادشاہ ایک دم چلّا اٹھا "یہ تو ہماری انگلی سے نکل کر دریا میں جا گری تھی۔"

بادشاہ کے مُنہ سے یہ بات سُن کر اب نان بائی بھی حیران ہوا۔ اس نے ادب سے کہا:

"میں سمجھا نہیں جہاں پناہ۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ انگوٹھی تو میرے صندوقچے سے گُم ہوئی تھی۔"

"نہیں نہیں۔" بادشاہ نے کہا۔ "ہم نے تمہارا امتحان لینے کے لیے اپنے وزیر کو تمہاری دوکان پر بھیج کر یہ انگوٹھی صندوقچے میں سے نِکلوالی تھی۔ تمہیں اس کا علم نہیں ہو سکا۔ ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ خدا پر تم جس ایمان اور بھروسے کا اعلان

کرتے ہو، کیا وہ سچ ہے۔ اب اس انگوٹھی کے ملنے سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تمہارا ایمان پکّا ہے۔"

اس کے بعد بادشاہ نے نان بائی کو سارا قصّہ سُنایا کہ کس طرح وہ شکار کھیلنے گیا اور دریا کنارے اُس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، وہ دریا میں گرا اور اِسی دوران میں اُنگلی سے انگوٹھی نِکل کر دریا میں گر گئی، جس کا ملنا محال ہی نہیں، ناممکن تھا۔ لیکن خدا ہر شے پر قادر ہے۔

تب نان بائی نے بادشاہ کو بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک مچھیرا مچھلیاں بیچتا ہوا آیا تھا۔ میں نے اس سے دو مچھلیاں خریدیں اور ایک مچھلی کے پیٹ میں سے یہ انگوٹھی نکل آئی۔

بادشاہ نے نان بائی کو اپنے برابر تخت پر بٹھایا اور اُسے اِنعام و اکرام سے نوازا۔ کچھ مُدّت بعد جب بادشاہ کو پتا چلا کہ یہ نان نائی قرآن اور حدیث کا بہت بڑا عالم بھی

ہے تو اُسے ملک کا سب سے بڑا قاضی بنا دیا۔